

کا علم عطائی ہے، حضور کا علم یوٹافوٹا بڑھا ہے، اور نزول قرآن پر مکمل ہوا ہے۔ رئیس صاحب: کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

حاضر و ناظر کے دلائل اور رئیس الاحرار صاحب:

اخیر کے کچھ صفحات میں رئیس صاحب نے مثبتین کے دلائل اور تائیدات کے بعض حصول پر لب کشائی کر کے خود ہی دیانت اور علم کی رسوائی کا سامان فراہم کیا ہے تفصیل ملاحظہ ہو: مہر بر لب:

ہم نے اپنی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے یا آپ کی وسعت علمی کے ثبوت میں کل دس آیتیں پیش کی تھیں، رئیس صاحب کی پوری کتاب پڑھ جائے، تین آیتوں کا تو نام ہی نہیں لیا، اور دو آیتوں پر اپنی دلیل ہونے کا لیل لگا دیا جس کو ہم انوکھی دلیل کے عنوان میں ذکر کر چکے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ تین آیتیں جن پر رئیس صاحب ”مہر بر لب“ ہیں اور جو اپنے موضوع پر بالکل واضح ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

[النحل: س ۱۶ ت ۸۹]

ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا . إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ﴾

[الجن: س ۷۲ ت ۲۶]

اللہ تعالیٰ جملہ غیب کا جاننے والا ہے۔ تو اپنے غیب پر خاص رسولوں کو ہی مطلع کرتا

ہے۔

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾

[البقرة: س ۲ ت ۲۵۵]

کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر جتنا خدا چاہے۔

ان صاف صریح روشن بیانیوں پر رئیس صاحب کی خاموشی بول رہی ہے کہ حق کے آفتاب نے باطل کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے اور کیوں نہ ہو، کہ ”جاء الحق وزهق الباطل

ان الباطل کان زھوفا“ حق آیا اور باطل مٹ گیا باطل تو مٹنے کے لیے ہی ہے۔
 اسی طرح وہ دو آیتیں جن کو رئیس صاحب نے انوکھے دلائل کے عنوان سے اپنی دلیل
 بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ آیتیں بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر غیوب ظاہر
 فرمائے، کیا صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ بھی تردید حاضر و ناظر کے ”انوکھے دلائل“ ہیں جواب ہو
 گیا۔ رئیس صاحب اتنا تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بعض مواقع پر خاموشی بھی انسان کو اقراری
 مجرم بنا دیتی ہے۔ آپ کی اس خاموشی نے سب پر عیاں کر دیا کہ آپ کے حالات کتنے ناگفتہ بہ
 ہیں۔

ع خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

سخن گفتن چہ ضرور:

اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ رئیس صاحب ”الشاہد“ کے بہت سے دلائل
 کے جواب سے عاجز و درماندہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ کہا وہ نہ کہنے سے بھی بدتر ہے۔
 جیسا کہ تشریحات ذیل سے ظاہر ہے۔

ہماری جانب سے پیش کردہ آیتوں میں قرآن عظیم کے مختلف مقامات کی وہ تین آیتیں
 بھی تھیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ”شاہد“ اور ”شہید“ کہا گیا ہے، طریقہ
 استدلال یہ تھا کہ شاہد کے حقیقی معنی حاضر ہیں۔ اگر آیت میں یہی مراد ہوں تو یہی آیت ہمارا عین
 دعویٰ ہے۔ اور اگر لفظ کے معنی مجازی گواہ لیے جائیں تو گواہی کے لیے مشاہدہ ضروری ہے، اور
 چونکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ساری مخلوق کے گواہ ہیں اس لیے سب کا مشاہدہ ضروری، تو
 اس معنی پر بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہوئے۔

ہماری اس دلیل کی پہلی شق پر مولوی عبدالرؤف صاحب نے یہ اقرار کیا کہ یہ لفظ متکثر
 المعنی ہے۔ مولوی رئیس احمد صاحب نے جھنڈے نگری صاحب کی بات پر اتنا اضافہ کیا کہ بیضا
 وی شریف سے اس لفظ کے پانچوں معانی شمار کرادیئے (۱) حاضر (۲) مددگار (۳) بادشاہ (۴)
 گواہ (۵) شہید فی سبیل اللہ۔ اور ہم پر دو الزام قائم کیے (۱) ہم نے بیضاوی کی عبارت میں کتر
 بیونت کی (۲) اور ہم شاہد کے صرف ایک معنی حاضر و ناظر مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:
 ”اب ناظرین ہی فیصلہ کریں۔ کہ بیضاوی کی عبارت میں بریلویوں نے تحریف کر

کے یہ معنی بتلائے کہ شہید کا معنی صرف حاضر ناظر ہے“ (ابطال ص ۹۱)

تجربہ کار اور اناڑی کھلاڑی میں یہی فرق ہوتا ہے، مولوی عبدالرؤف صاحب کہنہ مشق تھے، اس لیے گول مول بول کر رہ گئے، صاف اقرار نہیں کیا کہ اس لفظ کا حاضر و ناظر بھی ایک معنی ہیں، گو مطلب اس گول بات کا بھی ہے، لیکن رئیس صاحب زور تحقیق میں اقرار کر بیٹھے کہ حاضر اس لفظ کے معنی ہیں، اور صرف یہی نہیں یہ بھی اقرار کیا کہ یہ معنی نمبر ایک پر ہے، اور دوسرے معانی کا درجہ دوسرا ہے۔

حرکت مذہبوحی:

جس بات کو یہ دونوں ربیب و مربی سر اوعیاناً تسلیم کر رہے ہیں یہی بات ہم نے بھی لکھ دی تھی، کہ اس آیت کے یہی معنی علمائے اسلام نے مراد بھی لیے ہیں، جن میں ایک مانے ہوئے مترجم قرآن امام راغب اصفہانی ہیں، اور دوسرے فاضل بریلوی امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا ہیں، نہ جانے کیوں ہماری یہ بات رئیس صاحب کو اس درجہ لگ گئی، کہ چہرہ بگڑ گیا، زبان ٹیڑھی ہو گئی، اور آپ جامے سے باہر ہو گئے، اور ہم کو بڑی موٹی تازی مذہبوحی حرکت کا مرتکب قرار دیا، اور نہ جانے کیا کیا کہہ گئے۔

آخر رئیس صاحب امام احمد رضا کے نام پر کیوں اتنے برہم ہو گئے۔ اور انہیں کے ساتھ ذکر کئے ہوئے امام راغب اصفہانی کو کیوں پی گئے۔ یہ ترجیح بلا مرجع تو غالب کی زبان میں ستم ظریفی کہی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تھی ہنس کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں دو کے معنی صرف ایک:

اب ہم رئیس صاحب کے ان دونوں الزاموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان میں سے موخر الذکر (شاہد کے صرف ایک معنی بتانے کا الزام) کے کذب صریح ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہماری کتاب ”الشاہد“ موجود ہے، اس کا صفحہ ۵۳ دیکھ لیا جائے، ہم نے صاف صاف لکھ دیا، کہ ”شاہد“ اور ”شہید“ کے وہ معنی جو یہاں مراد لیے جاسکتے ہیں ”دو ہیں“ ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رئیس صاحب کے یہاں دو کا مطلب صرف ایک ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے تھے کہ رئیس صاحب اہل زبان کی بولی بھی نہیں سمجھتے ورنہ کوئی اور زبان استعمال کرتے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
گران کو نہ دے عقل تو دے مجھ کو زبان اور
یہ دو کو ایک بنا دینا رئیس صاحب کے حوصلہ کی ہی بات ہے۔

تنبیہ:

نیز اہل علم و زبان پر یہ امر بھی پوشیدہ نہ ہوگا کہ ہم نے یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ شہد و شاہد
کے صرف دو معنی ہیں، بلکہ یہ لکھا ہے کہ وہ معنی جو یہاں مراد لیے جاسکتے ہیں دو ہیں۔ اس کا
مطلب بھی یہ ہے کہ معافی اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس مقام کے مناسب نہیں، مناسب یہ دو
معانی ہیں۔ اس لیے ہمارا دعویٰ نہ تو ایک میں حصر کا ہے نہ دو میں، ہمیں کیا پتہ تھا کہ لکھنورہ کر بھی
رئیس صاحب کی زبان کا ذائقہ اس قدر خراب ہے۔ حضرت سعدی نے ٹھیک ہی فرمایا ہے:

سگ بدریائے ہفت گانہ بشو چونکہ تر شد پلید تر باشد

تصور الثانی نکل آیا:

رہ گیا دوسرا الزام کہ ہم نے بیضاوی کی عبارت میں کتر بیونت کی ہے، اس کی حقیقت
ملاحظہ ہو: جس عبارت کے بارے میں الزام ہے وہ پوری یہ ہے:

”الشهداء جمع شهيد بمعنى الحاضر، أو القائم بالشهادة أو الناصر
أو الامام“ و كأنه سمي به؛ لأنه يحضر النوادي، ويلزم بمحضر الأمور“ إذ
التركيب للحضور، إما بالذات أو بالتصور، ومنه قيل للمقتول في سبيل الله
شهيداً؛ لأنه حضر ما كان يرجوه، أو الملائكة حضروه. [بیضاوی، ص: ۲۵]

شہد، شہید کی جمع ہے، اس کے معنی حاضر، گواہ، اور مددگار اور امام کے ہیں۔ ”امام کو
شاہد اس لیے کہا گیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوتا ہے یا اس کے حضور معاملات طے کیے جاتے
ہیں۔“ یہ اس لیے کہ لفظ شاہد کی ترکیب ہی حضور کے لیے ہے، چاہے خود حاضر ہو چاہے تصور کا
حضور ہو، شہیدی فی سبیل اللہ کو بھی اسی لیے شہید کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مراد پر حاضر ہوا، یا اس لیے کہ
خدا کے فرشتے شہادت کے بعد اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔

ہم کو صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ شاہد کے معنی حقیقی حاضر ہیں۔ اس لیے پوری عبارت
میں سے ہم نے صرف وہی حصہ نقل کیا جس پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے، اور جس کی اثبات مدعی کے

لیے ضرورت تھی۔ زائد معافی کے لیے ہم نے نفیاً یا اثباتاً کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا تھا تو زائد عبارت کو ہم کیوں نقل کرتے۔ غیر متعلق عبارت کو نقل نہ کرنا ہرگز ”کتر بیونت“ نہیں ہے، اور یہی ”کتر بیونت“ ہے تو رئیس صاحب کی اس حرکت کا کیا نام ہوگا، کہ یہ دعویٰ کرنے کے بعد بھی کہ ہم پوری عبارت نقل کرتے ہیں بیچ میں سے یہ پورے دو جملے اڑا دیے۔ ”کائنہ سمي به لآنه يحضر النوادی، أو يلزم بمحضرة الأمور۔“

داغ داغ:

رئیس صاحب آپ نے ادھوری عبارت کو پوری کہا، یہ جھوٹ ہوا، بیچ میں سے عبارت کے دو جملے چھپا لیے یہ چوری ہوئی، خود ”کتر بیونت“ کی اور ہم پر الزام لگایا یہ افترا پر دازی ہوئی، ذرا بھی ڈرنے ہوا کہ کوئی شخص بیضاوی سے آپ کی نقل کردہ عبارت کا تقابل بھی کر سکتا ہے، یہ وقاحت ہوئی، خود ہی ظلم و تعدی کی اور ہمارے خلاف ناظرین کو دہائی دی یہ ظلم ہوا۔ آپ اپنے دعویٰ کو کہاں چھپائیں گے؟

بتاؤ یا روبرو محشر چھپے گاکشتوں کا خون کیوں کر

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شہادت کے حقیقی معنی حاضر ہیں:

اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ نے یہ حرکت کیوں کی، اگر وہ ہضم کی ہوئی عبارت بھی ظاہر کر دیتے تو لوگ جان جاتے کہ شاہد کے حقیقی معنی حاضر ہی ہیں، کیوں کہ امام بیضاوی اس عبارت میں امام کے معنی مجازی ہونے کی دلیل دے رہے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ چون کہ لفظ شاہد کی وضع ہی حضور کے لیے ہے۔ اسی وجہ سے امام کو شاہد کہتے ہیں، کہ وہ قوم کی مجالس میں حاضر رہتا ہے، یا اس لیے کہ اسی کے سامنے معاملات طے کیے جاتے ہیں، اور اسی لیے شہید فی سبیل اللہ کو بھی شہید کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مراد پر حاضر ہوا۔ یا اس لیے کہ شہید کے بعد فرشتے اس کے پاس حاضر ہوئے، قاضی زادہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

کہ مددگار کو بھی اسی لیے شاہد کہا جاتا ہے کہ تمام امور اسی کی موجودگی میں اسی کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں۔ عبارت ان کی یہ ہے:

”والظاهر أن الناظر أيضاً يسمى شهيداً لذلك؛ فإن تمام الأمور تحصل بحضوره.“ [حاشیہ ص: ۱۹۵]

پس ان دونوں عبارتوں سے ثابت ہوا کہ شہود کے حقیقی معنی حضور کے ہیں۔ اور دوسرے مجازی معانی پر جو اس کا اطلاق ہوتا ہے تو اسی لیے کہ ان سب معانی میں بھی کسی نہ کسی طرح کا حضور پایا جاتا ہے۔

معنی حقیقی کی نفی کے لیے رئیس صاحب کی جدوجہد:

یہاں تک پہنچ کر رئیس صاحب کو یہ احساس ہوا کہ اب بحث کا وہ موڑ آ گیا ہے کہ مخالفین سے حاضر و ناظر کا ثبوت مانگنے کے بجائے خود مجھے ہی صفائی دینے کی ضرورت ہے، کہ جب شاہد کے حقیقی معنی حاضر و ناظر ہیں تو کیوں نہ وہی معنی مراد لیے جائیں، اس سے پھیر کر مجازی معنی مراد لینے کا کیا جواز ہے؟ تو اس مضمون پر خامہ فرسائی کی، وہ لکھتے ہیں:

”ہم کہتے ہیں کہ بریلویوں کا اگر دعویٰ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ”شہید و شاہد“ کہا گیا ہے اس لیے حاضر و ناظر ہو گئے، تو یہ ماننا بھی لازم ہوگا کہ جس دن بھی قرآن نے آپ کو شاہد و شہید کہا اسی دن سے آپ ”حاضر و ناظر“ ہو گئے۔ اور تمام علوم، احکام، اور تخلیق آدم سے وقوع قیامت تک تمام امور سے باخبر ہو گئے۔ کوئی چیز آپ پر مخفی نہ رہ گئی، لیکن بہت سی آیات میں اور احادیث میں بار بار علم غیب کی نفی ہے اور احکام شریعت لے کر بار بار جبرئیل کا آنا، منافقین مدینہ کے بارے میں آپ کو علم نہ ہونا، اور علوم خمسہ وغیرہ سے آپ کی بے خبری ظاہر و باہر ہے، تو آپ سب سے باخبر کیسے تھے؟ جن آیتوں کے معنی بریلوی لوگ حاضر و ناظر بتاتے ہیں ان کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کوئی ستم ظریف کہے، کہ سرخ رو کے معنی غصہ ور ہے، کیوں کہ اس لفظ کے معنی لال چہرے والا، اور غصہ میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، حالانکہ اردو داں طبقہ کے نزدیک سرخ رو کے معنی کامیاب اور معزز ہیں۔ ہندوستان کے غیر عربی داں عوام میں بہت سے لوگ بریلویوں کے اس دام تزویر میں پھنس گئے ملخصاً“ [ابطال، ص: ۷۰-۷۱-۷۲]

غالب نے کہا ہے:

میری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی

ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

سو ہم دیکھ رہے ہیں کہ رئیس صاحب کی ہر تعمیر کو شش بھی ان کی تخریب کا سامان بنتی جا رہی ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے، مولوی عبدالرؤف صاحب اپنی کہنہ مشقی کے سبب اس موضوع پر اپنے موقف کی کمزوری سے آگاہ تھے، اس لیے ایک گول لفظ متکثر المعنی کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اور بقول کے ایک چپ میں سو بلا ٹالی، لیکن رئیس صاحب نے تہور سے کام لے کر متکثر المعنی ہونے کی سند بھی پیش کر دی، جس کے نتیجہ میں مختلف جرائم کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ اس لفظ کے معنی حقیقی حاضر و ناظر ہیں، اس لیے اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس معنی کو رد کیسے کیا جائے، ادھر اپنے میگزین کو دیکھا تو ان خام خیالیوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں، جن کا وہ بار بار اعادہ کر چکے ہیں۔ اور دنداں شکن جواب پا چکے ہیں۔ ناچار پھر انہیں کو دہرایا۔ آیت سے ثابت ہے کہ خدا کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں۔ امور خمسہ کا علم کسی کو نہیں۔ منافقین کی خبر رسول اللہ ﷺ کو نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے ثابت ہے کہ انہیں یہ علم نہیں، انہیں وہ علم نہیں۔ اس لیے شاہد کے معنی حاضر و ناظر نہیں ہو سکتے۔

بالک ہٹ:

پھر شاید خیال آیا کہ ان سب باتوں کا جواب تو ہمارا خصم دے آیا ہے اور اس نے یہ کہہ کر تو ہمارے منہ پر مہر بھی لگا دی ہے کہ ”ہمارا دعویٰ رسول اللہ ﷺ کے تکمیل علم کے سلسلہ میں یہ ہے کہ نزول قرآن کے اختتام پر آپ کا علم مکمل ہوا، اس لیے منکرین کے پاس اس کے بعد کسی چیز کے عدم علم کا ثبوت ہو تو لادیں، اور ہمارے پاس کوئی آیت یا حدیث ایسی نہیں جس میں ان کی نفی ہو، سب اختتام نزول سے پہلے کے ہی ہیں، اس لیے آپ نے ایک آخری جست لگائی، جست کیا ہے اک لغزش مستانہ ہے، اک جرأت رندانہ ہے، کہ گو ہمارا خصم لاکھ کہہ رہا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو ابتدا ہی سے جمیع امور کا علم نہیں مانتے، لیکن زبردستی اس کو ماننا ہی پڑے گا، کہ آپ ﷺ ابتدا ہی سے ہر چیز کے عالم تھے۔ کسی نے کہا ارے صاحب یہ کیا زبردستی ہے، آپ نے فرمایا: میاں زبردستی وغیرہ کچھ نہیں۔ بریلویوں کو تو یہ ماننا ہی ہے، بغیر مانے ہماری دلیل مکمل ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے ان پر لازم ہے کہ اپنے دعویٰ میں ترمیم کر کے ہماری دلیل کی زد کے لائق بنائیں، کوئی کھیل تھوڑا ہی ہے۔ ماننا ہے، ماننا ہے، ماننا ہے۔

دنیا میں تین ہٹیں مشہور ہیں: راج ہٹ۔ تریا ہٹ۔ بالک ہٹ۔ ہم حیران ہیں کہ اس

کو کس میں شمار کریں؟ رئیس صاحب کی اس ضد کے سلسلہ میں بھی ”پھڑ بازی“ کے عنوان سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں وہیں ملاحظہ کیا جائے۔

حقیقت مجبورہ اور مستعملہ:

رہ گیا ان کا یہ کہنا کہ شاہد کے معنی حاضر و ناظر مراد لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ”ستم ظریف“ یہ کہے کہ سرخ رو کے معنی لال چہرہ والا، حالاں کہ ان کے معنی باغیرت کے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ معنی حقیقی کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) حقیقت مجبورہ۔ (۲) اور حقیقت مستعملہ۔

جس لفظ کے معنی حقیقی اور مجازی دونوں استعمال میں ہوں وہ حقیقت مستعملہ ہے جیسے لفظ شیر کہ اس کے حقیقی معنی ایک مخصوص درندہ ہیں اور آج بھی یہ لفظ اپنے اس معنی پر بے شمار مواقع میں استعمال ہوتا ہے۔ اور مجازی معنی بہادر کے ہیں کہ قرینہ ہو تو لفظ شیر بول کر بہادر آدمی بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ اور اگر اہل زبان و محاورہ نے اس لفظ کو اس حقیقی معنی میں بولنا چھوڑ دیا ہو، اور صرف مجازی معنی ہی مراد لیے جاتے ہوں جیسے یہی لفظ سرخ رو کہ اب اس کے صرف مجازی معنی باعزت ہی مراد لیے جاتے ہیں تو یہ حقیقت مجبورہ ہوئی۔

قاعدہ یہ ہے کہ حقیقت مستعملہ بول کر اس کے حقیقی معنی ہی مراد لیے جائیں گے، ہاں کوئی قرینہ ہو کہ حقیقی معنی مراد نہیں۔ تب البتہ حقیقی معنی مراد لینا بہر حال غلط ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ شاہد و شہید کے حقیقی معنی حاضر و ناظر بھی مجبور و متروک ہیں یا نہیں، اگر معنی حقیقی متروک ہوں اور ہم کو ان کے مراد لینے پر اصرار ہو تو یہ ضرور ہماری ستم ظریفی ہوگی۔ اور اگر متروک نہ ہوں اور جان بوجھ کر رئیس صاحب اس کو متروک قرار دے رہے ہوں تو یہ ان کی ستم ظریفی ہوگی۔ اور لاعلمی میں یہ گل کھلا رہے ہوں تو جہالت قرار دی جائے گی۔ تو حقیقت امر یہ ہے کہ پورے قرآن عظیم میں لگ بھگ ۱۶۰ جگہ شہادت کے مشتقات کا ذکر آیا ہے جس میں ۳۰ جگہ اس کے حقیقی معنی مراد ہیں۔

پس یہ ایک حقیقت مستعملہ ہوئی، رئیس صاحب اس کو سرخ رو پر قیاس کر کے حقیقت مجبورہ قرار دے کر ستم ظریف ہوئے یا جاہل، فیصلہ ہم خود انہیں کی صواب دید پر چھوڑتے ہیں۔

شہادت اور گواہی:

آیات شہادت سے استدلال کے دوسرے پہلو پر مولوی عبدالرؤف صاحب نے ذرا کھل کر کلام کیا تھا، جس کا خلاصہ یہ تھا:

- (۱) حضور قیامت میں شہادت نہیں ادا کریں گے، صرف امت کے مژکی ہوں گے۔
- (۲) شہادت ادا کریں تب بھی حاضر و ناظر نہ ہوں گے کہ شہادت کے لیے مشاہدہ ضروری نہیں۔

(۳) اگر رسول اللہ ﷺ کو شاہد کہہ دینے پر وہ حاضر و ناظر ہو گئے تو امت کو بھی شاہد کہا گیا ہے، لہذا وہ بھی حاضر و ناظر ہوئی۔

پہلی بات کا جواب ہم نے الشاہد میں دیا تھا کہ پہلی آیت کے لیے جھنڈے نگری صاحب کی بات کسی حد تک درست ہے، لیکن دوسری آیت کی تفسیر میں مدارک و خازن میں پوری امت دعوت پر آپ کی گواہی کی تصریح ہے، اور تیسری آیت کی تفسیر میں تفسیر کبیر، مدارک و خازن میں شاہداً علی الخلق کلہم ساری مخلوق پر گواہ آیا ہے، اس لیے صرف یہ کہہ دینے سے کام نہ چلے گا، کہ آپ مژکی ہوں گے، بلکہ دوسری اور تیسری آیت کی مندرجہ بالا تفسیروں کا بھی جواب دینا ہوگا۔

مولوی رئیس احمد صاحب نے ہماری اس تشریح سے صاف آنکھیں بند کر لیں اور فرماتے ہیں:

یہ بات بریلویوں اور اہل حق کے درمیان متفق علیہ ہے کہ جن آیات میں رسول اللہ ﷺ کو شاہد اور شہید کہا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ آپ قیامت کے روز بطور شاہد و شہید اللہ کے سامنے فریضہ شہادت انجام دیں۔ [ابطال، ص: ۷۷]

اور لگ بھگ پانچ صفحوں میں یہ تفصیل پیش کی ہے کہ کس طرح گذشتہ امت اپنے رسولوں کی تکذیب کرے گی، اور کس طرح گذشتہ انبیا امت محمدیہ کو اپنی تصدیق کے لیے پیش کریں گے۔ اور کس طرح امت محمدیہ پر اعتراض ہوگا کہ یہ کیسے گواہی دیتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر اپنی امت کا تزکیہ کریں گے۔ اور صفائی کریں گے کہ میری امت ٹھیک کہہ رہی ہے، لیکن بقیہ دونوں آیتوں کی تفسیروں کو جن کے جواب کا الشاہد میں مطالبہ تھا، صاف طرح دے

گئے، جس کا مطلب یہی تو ہوا:

وہ بات سارے فسانہ میں جس کا ذکر نہیں وہ ایک بات انہیں ناگوار گذری ہے اس لیے شہادت والی یہ دونوں آیتیں ہی اپنی مذکورہ تفسیروں کے ساتھ رئیس صاحب کے سر پر سوار ہیں، اور مطالبہ کے باوجود لا جواب ہیں، پس حاضر و ناظر کے ثبوت کی گزشتہ پانچ آیتوں کے ساتھ یہ دو مل کر سات ہوئیں جن کے جواب سے یہ منکرین علم غیب رسول عاجز رہے۔
سن کر گواہی:

دوسری بات کے ثبوت میں مولوی عبدالرؤف صاحب نے مدارک شریف کی یہ عبارت پیش کی تھی کہ ”بعض معاملات کی گواہی سن کر بھی دی جاسکتی ہے“۔

ہم نے اپنی کتاب الشاہد میں اس کا جواب یہ دیا تھا کہ وہ چند استثنائی واقعات ہیں جہاں مجبوراً سچی شہادت گوارا کر لی گئی ہے۔ ان کو شہادت کے حقیقی معنی کے معارضہ کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ثبوت بھی ہم نے کتب فقہ سے پیش کیا تھا، اور اپنی اس بات کے ثبوت میں کہ شہادت کے لیے حضور کو مشاہدہ ضروری ہے، ہم نے عنایہ شرح ہدایہ، بیضاوی، اور مفردات راغب کا حوالہ دیا تھا۔

پھر وہی کتر بیونت:

مولوی رئیس صاحب نے ہماری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا کہ مدارک کی عبارت سے معارضہ غلط ہے، البتہ عنایہ کی عبارت کے سلسلہ میں انہوں نے ہم پر دو الزام رکھے۔

(۱) عنایہ کی عبارت کتر بیونت کر کے پیش کی ہے۔

(۲) علما کی عبارت کا غلط مطلب سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

[ابطال، ص: ۹۱]

اور عنایہ کے رد میں ہدایہ کی عبارت پیش کی ہے، ہم پہلے عنایہ کی پوری عبارت درج

کرتے ہیں:

عنایہ کی عبارت:

”(۱) الشہادة في اللغة عبارة عن الاخبار بصحة الشيء عن

مشاہدہ و عیان، ولہذا قالوا: إنها مشتقة من المشاہدۃ التي تبني عن المعاینۃ، وفي اصطلاح اہل الفقہ عبارتہ عن إخبار صادق في مجلس الحكم بلفظ الشہادۃ، فالإخبار كالجنس يشملها والأخبار الکاذبۃ، وقولہ: صادق يخرج الکاذبۃ، وقولہ في مجلس و بلفظ الشہادۃ يخرج الأخبار الصادقۃ غیر الشہادۃ و سببها معانیہ ما تحملها (۲) مشاہدۃ بما تختص مشاہدۃ من السماع في المسموعات والأخبار والأبصار في المبصرات ونحو ذلك۔“

[عنايہ جلد ۲، ص ۶۰]

لغت میں شہادت کہتے ہیں کسی چیز کی صحت کی خبر کو مشاہدہ اور معائنہ کر کے، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ وہ لفظ مشاہدہ سے بنا ہے جس کے معنی معائنہ کے ہیں۔ اصطلاح فقہاء میں فیصلہ کی مجلس میں کسی بات کی لفظ ”شہادت“ دیتا ہوں کے ساتھ سچی خبر دینا ہے۔ شہادت کی تعریف میں خبر کا لفظ بمنزلہ جنس ہے، جس میں جھوٹی سچی خبریں شامل ہیں، اور لفظ صادق کہا تو جھوٹی خبر اس سے الگ ہوگئی، اور فیصلہ کی مجلس اور شہادت کے لفظ سے شہادت کے علاوہ سچی خبریں بھی علاحدہ ہو گئیں، اور گواہی کا سبب یہ کہ جس امر کی گواہی دے رہا ہے، اس کا معائنہ کر رہا ہے جس کا شاہد بن کر ہوتا ہے، اگر وہ سننے سے تعلق رکھتی ہو، اور دیکھنے والی چیز کا دیکھ کر اسی طرح اور بھی ہے۔

ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ شہادت کے لیے معائنہ اور حضور ضروری ہے، اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم نے خط کشیدہ عبارت (۱) پیش کی، جتنی عبارت ہم نے پیش کی وہ تو ہمارے دعویٰ پر عبارت النص ہے۔ بعد والی عبارت میں اگر کوئی لفظ اس کے خلاف ہو تب تو ہم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہم نے عبارت کے معنی غلط سمجھانے کی کوشش کی۔ الحمد للہ کہ رئیس صاحب ایسا کوئی لفظ نہیں دکھا سکتے، اس کے برخلاف رئیس صاحب نے خط کشیدہ عبارت (۲) پیش کر کے جو تاثر دینا چاہا ہے، وہ البتہ غلط معنی سمجھانے کی بھرپور کوشش کہا جائے گا۔

کیوں کہ عبارت کا مطلب تو یہ ہے کہ گواہی اس لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی گواہی کا معائنہ اور مشاہدہ کیے ہوئے ہوتا ہے، سنی سنائی باتوں کی گواہی نہیں دیتا، بلکہ موقع پر موجود رہ کر جو چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اس کو خود وہ دیکھتا ہے، اور جو چیز سننے سے تعلق رکھتی ہے اس کو خود سنتا

ہے۔ اسی طرح جو چھونے سے تعلق رکھتی ہے اس کو خود چھوتنا ہے، وغیرہ ذلک۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے خود الشاہد ص ۵۶ میں ”تنبیہ“ کے عنوان سے ذکر کر کیا ہے۔ اس کا ہرگز وہ مطلب نہیں جو رئیس صاحب باور کراتے ہیں، کہ خود چاہے موقع پر موجود نہ ہو کسی دوسرے سے حالات سن کر گواہی دے سکتا ہو۔ رئیس صاحب کی یہ بات تو بداہت کے خلاف ہے، بھلا دنیا میں کون ایسی کچہری ہوگی جس میں گواہ کا موقع پر موجود رہنا ضروری نہ قرار دیا جاتا ہو۔ تو رئیس صاحب نے اپنی اس حرکت سے نہ صرف یہ کہ عنایہ کی عبارت کا غلط مطلب سمجھایا بلکہ حقیقت کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش کی اور غلط فہمی کا الزام رکھا، ہم پر یہ تو اسی قسم کی بات ہوئی نہ

خود فراموشی کند تہمت نہداستاد را

اور عبارت کی کتر بیونت کا حال تو یہ ہے، کہ پوری عبارت دیکھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس نے تراش خراش کی ہے، ہم نے تو جو حصہ بھی نقل کیا ہے مکمل۔ لیکن رئیس صاحب کا حال یہ ہے کہ ایک ہی جملہ کے اول و آخر کو حذف کر کے عبارت کو اپنے مفید مطلب بنانے کی کوشش کی ہے، ان کا نقل کردہ حصہ (جس پر ہم نے (۲) کا خط کھینچا ہے) شروع ہوتا ہے و سببھا سے اور ختم ہوتا ہے ونحو ذلک پر لیکن آپ نے ابتدا کے تین لفظ معطوف علیہ سمیت حذف کر دیے۔ اور صرف مشاہدہ سے نقل کرنا شروع کیا۔ اور آخر سے نحو ذلک معطوف کو حذف کر دیا، اتنی تراش خراش خود کی اور ہم پر الزام لگایا کتر بیونت کا۔ ع

چہ دلا اور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

ہدایہ کی عبارت:

اسی طرح ہدایہ کی عبارت تو خود انہیں کا ردِ بلیغ ہے، اپنی تائید سمجھنا بدحواسی کے ذیل

میں آتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے

وحشت میں ہر اک نقشہ الثا نظر آتا ہے

مجنوں نظر آتی ہے لیلانظر آتا ہے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صاحب ہدایہ علیہ الرحمہ نے اصلی اور ذیلی گواہی کا فرق ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ”اصلی گواہ (موقع) جس نے واقعہ میں جو چیز دیکھنے کے لائق ہو اس کو خود دیکھا ہو، اور جو سننے کے لائق ہو اس کو خود سنا ہو، جو چھونے سے تعلق رکھتا ہو اس کو خود چھو کر معلوم کیا ہو، یہ شخص حاکم کے وہاں گواہی دے سکتا ہے۔ دوسرا ذیلی گواہ جس کی گواہی کو شہادت علی

الشہادت کہا جاتا ہے، ایسے گواہ کو جب تک اصل گواہ یہ کہہ کر کہ میری گواہی کا تو گواہ ہو جا، گواہ نہ بنائے، شرعاً یہ گواہی نہیں دے سکتا۔“

اسی کورئیس صاحب یہ کہتے ہیں کہ گواہ کے لیے دیکھنا ضروری نہیں ہے، ہدایہ کی عبارت سامنے ہے ناظرین خود فیصلہ کر لیں:

”وما تحمله الشاهد علی ضربین: ما یثبت حکمہ بنفسہ مثل البیع والغضب والقتل وحکم القاضي، فإذا سمع ذلک الشاهد أورآه وسعه أن یشهد علیہ، ویقول أشہد أنه باع. ولو سمعه من وراء الحجاب لا یجوز له أن یشهد. ومنه ما لا یثبت حکمہ بنفسہ مثل الشہادة علی الشہادة، فإذا شہد شاهداً یشہده بشيء لم یجز له أن یشہد علی الشہادة إلا أن یشہد علیہا. (ملخصاً)“

[ہدایہ اخیرین ص: ۴۲۰]

اور گواہی دو قسمی ہوتی ہے، ایک وہ جس کا حکم خود اسی سے ثابت ہو جیسے بیع، غضب، قتل، اور قاضی کا فیصلہ، اور کسی نے ان واقعات کو خود دیکھا اور ان میں سننے کی بات کو خود سنا تو وہ گواہ ہو گیا۔ قاضی کے وہاں کہہ سکتا ہے کہ میں فلاں کے بیچنے کی گواہی دیتا ہوں خواہ گواہ بنایا گیا ہو یا نہ بنایا گیا ہو۔ اور اگر وہ ایجاب و قبول کو پر دے کے پیچھے سے سنے تو گواہی نہ دے سکے گا۔ اور وہ گواہی جس کا حکم خود اسی سے ثابت نہ ہو جیسے شہادت علی الشہادت، اس میں کسی گواہ کو گواہی دیتے دیکھ کر گواہی دینا چاہیے تو نہیں دے سکے گا جب تک کہ اصل گواہ اس کو اپنی گواہی کا گواہ نہ بنائے۔

کس درجہ حیرت ناک بات ہے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اصل گواہ کو خود سنا اور دیکھنا ضروری ہے یہاں تک کہ موجودہ کر خود سنا لیکن بولنے والے اور گواہ میں حجاب تھا تو گواہی صحیح نہیں۔ اور مولوی رئیس صاحب کہتے ہیں کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ گواہی کے لیے دیکھنا ضروری نہیں۔ اور ہدایہ صفحہ ۱۴۲ کی مذکورہ بالا عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کیا اور ص: ۱۴۳ کی یہ تشریح انہیں نہیں سوجھی جو ان کے صفر اکا پورا پورا علاج ہے۔

”ولا یجوز الشاہد أن یشہد بشيء لم یعانیہ إلا النسب والموت والنکاح والدخول وولاية القاضي؛ فانه له أن یشہد بهذه الأشياء إذا أخبره من

يثق به، والقياس أن لا يجوز؛ لأن الشهادة مشتق من المشاهدة. والاستحسان أن هذه الأمور تختص معاناة أسبابها خواص من الناس، فلو لم يقبل الشهادة بالسامع أدى إلى الحرج (ملخصاً)“ [ہدایہ، ص: ۱۴۳]

نسب، موت، نکاح، ولایت قاضی کے سوا ان دیکھی چیزوں کی گواہی جائز نہیں، مذکورہ بالاستثنیات میں البتہ قابل بھروسہ آدمی سے سن کر گواہی دی جاسکتی ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان مستثنیات میں بھی بے دیکھے گواہی معتبر نہ ہو مگر قیاس خفی کا تقاضا یہ ہے کہ ان چیزوں کے اسباب کا مشاہدہ بہت تھوڑے لوگ کرتے ہیں۔ تو ان میں بھی بے دیکھے گواہی قبول نہ کی جائے تو لوگوں پر بڑی تنگی ہوگی۔

کس وضاحت سے صاحب ہدایہ فرما رہے ہیں کہ پانچ معاملات کے علاوہ سن کر گواہی جائز نہیں، اور ان کے جائز ہونے، بنیاد معذوری اور مجبوری اور دفع حرج ہے۔ معلوم ہوا کہ اس سے اصل شہادت کے خلاف سند نہیں پکڑی جاسکتی، اور معلوم ہوا کہ رئیس صاحب کی ساری اچھل کود کے باوجود بات وہیں رہی جہاں تک ”الشاہد“ میں پہونچائی گئی تھی، کہ شہادت کے لیے معائنہ ضروری ہے۔

امت بھی حاضر و ناظر ہے:

مولوی عبدالرؤف کی تیسری بات کا جواب ہم نے ”الشاہد“ میں یہ دیا تھا کہ امتی اس لیے حاضر و ناظر نہ ہوں گے کہ ان کی شہادت اصلی نہیں ہوگی، شہادت علی الشہادۃ ہوگی۔ چنانچہ جب امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا کہ تم تو موقع پر موجود ہی نہ تھے، شہادت کیسے دے رہے ہو، تو کہیں گے: ”بأخبار القرآن علی لسان نبیک الصادق۔“ آپ کے سچے نبی کی زبان سے قرآن سن کر، امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی گواہی شہادۃ علی الشہادۃ ہے۔

رئیس صاحب نے ہماری ان باتوں کی تردید نہیں کی بلکہ یہ لکھ کر تصدیق ہی کر دی کہ: ”تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت حضرت جبرئیل کی خبر کے مطابق ہوگی، اس لیے جس طرح امت حاضر و ناظر نہیں، رسول بھی حاضر و ناظر نہ ہوں گے۔“

ہمارا کہنا یہ ہے کہ:

اولاً:- کیا جبرئیل کے بارے میں مولوی رئیس صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حاضر و ناظر ہیں، اس لیے کہ بقول ان کے جبرئیل کی شہادت اصلی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی ان سے سن کر۔
 ثانیاً:- امت کی گواہی کے شہادت علی الشہادۃ ہونے کے تو حدیث میں دو قرینے موجود ہیں۔ پہلا قرینہ یہ ہے کہ ان سے سوال ہوگا کہ تم موقع پر موجود نہ تھے تو گواہی کیسی؟ اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ انہوں نے اقرار کیا کہ ہماری گواہی رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی گواہی بھی جبرئیل امین سے سن کر ہے، اس کا کیا ثبوت ہے؟ بلکہ یہاں تو آپ کی گواہی کے اصلی ہونے کا ہی قرینہ موجود ہے، کہ حضور ﷺ بھی گذشتہ انبیاء کے زمانہ میں جسماً موجود نہ تھے، پھر بھی آپ سے یہ سوال نہیں ہوا کہ آپ کس طرح گواہی دے رہے ہیں؟ اس لیے ثابت ہوا کہ آپ کی گواہی اصل اور آپ حاضر و ناظر ہیں۔ رئیس صاحب ہم کو آپ سے ہمدردی ہے۔ آپ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس فضیلت عظمیٰ کی رسول اللہ ﷺ سے نفی ہو جائے۔ اگرچہ جبرئیل امین کے لیے اس کا ثبوت ماننا پڑے۔ مگر آپ کی محنت ضائع گئی۔ کیا کیجیے گا وحشت میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔

سوار ترادامن ہاتھوں میں میرے آیا جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

مدت شہادت اور ضعیف حدیثوں سے قرآن کے خلاف استدلال:

شہادت سے متعلق دو باتیں رئیس صاحب نے اور بھی کہی ہیں:

(۱) شہید و بصیر کے معنی حاضر و ناظر مان لیے جائیں تب بھی اس کو بنیاد بنا کر رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ کے لیے حاضر و ناظر اور عالم ماننا صحیح نہیں، کیوں کہ سورۃ مائدہ میں شہادت کی مدت کو انبیاء کی حیات تک محدود بتایا گیا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنتَ الرَّقِيبَ

عَلَيْهِمْ﴾

[المائدہ: ۵، ت. ۱۱۷]

یعنی اے اللہ میں اپنی امت کے انہیں حالات کی بابت گواہی دے سکتا ہوں جو میری موجودگی میں ہوئے، اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھالیا تو تو ان پر قریب رہ گیا، تو

جب آپ کی گواہی آپ کی دنیاوی زندگی تک محدود ہے تو بعد کے حالات سے آپ کیسے باخبر ہو سکتے ہیں؟۔

(۲) جب آیت مذکورہ بالا سے آپ کا علم محدود ثابت ہو گیا تو بعد وفات ثبوت علم آیات قرآنیہ یا حدیث متواتر و مشہور سے ہی ہو سکے گا، قرآن کی آیات بالا کے خلاف ضعیف روایتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہو سکتا جیسا کہ ”الشاہد“ میں حضور کے لیے قبر میں اعمال امت کی پیشی کو ضعیف روایتوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جواب ہماری گزارش یہ ہے کہ مذکورہ بالا مدعا پر سورہ مائدہ کی آیت مذکورہ سے استدلال غلط ہے، کیوں کہ استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ آیت میں ذکر کیے ہوئے لفظ شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ اور آدمی گواہ نہ رہے تو عالم بھی نہ رہے گا۔ حالاں کہ آیت میں لفظ شہید گواہ کے معنی میں نہیں (رقیب) نگران اور مسئول الیہ کے معنی میں ہے، اور گواہی ہو یا نگرانی ان دونوں کے عدم سے علم کا معدوم ہونا لازم نہیں۔

پہلی بات کا ثبوت یہ ہے کہ جلالین شریف میں اس بات کی تصریح ہے کہ آیت میں شہید کے معنی رقیب کے ہیں:

﴿وَكُنْتَ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾ رَقِيبًا أَمْنَهُمْ مِمَّا يَقُولُونَ: ﴿مَا دَمْتَ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي﴾ قَبَضْتَنِي بِالرَّفْعِ إِلَى السَّمَاءِ ﴿كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ الْحَفِیْظُ لِأَعْمَالِهِمْ. [تفسیر المائدہ: ت ۱۱۷، ص ۱۲۷]

میں ان کا نگران تھا، انہیں ان کی باتوں سے روکتا تھا اور جب تو نے مجھے آسمان کی طرف اٹھالیا تو تو ہی ان کے اعمال کا نگران رہ گیا۔

دیکھیے اس عبارت میں صاف صاف شہید کے معنی رقیب تحریر ہیں جس کی روشنی میں آیت کا مطلب ہوا کہ میں اپنی دنیاوی زندگی میں ان کے اعمال کا نگران رہا، اور بعد وفات نگران نہ رہا۔

اور نگران نہ رہنے کے لیے نہ گواہ ہونا لازم نہ لا علم ہونا لازم ہے، کہ نگران نہ رہے تو گواہ بھی نہ رہیں، یا نگران نہ رہے تو عالم بھی نہ رہیں، کیوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی کسی کا نگران نہ ہو اس کا گواہ بھی نہ ہو، لیکن اس کے حالات سے باخبر ہو اور ان کا عالم ہو۔

تو شہید کے معنی بالفرض آیت میں گواہ بھی ہوں تب بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ بعد وفات آپ گواہ نہ رہے۔ نہ یہ کہ آپ عالم بھی نہ رہے۔

اور یہیں سے رئیس صاحب کی دوسری بات کا جواب بھی ہو گیا، کیوں کہ اس دوسری بات کی بنیاد بھی آیت کی اس غلط تعبیر پر تھی، اور فاسد پر جس کی بنیاد ہو وہ بھی فاسد ہی ہے۔

تو جب آیت مذکورہ نے بعد وفات کے علم پر نفیاً واثباتاً کوئی روشنی ہی نہیں ڈالی تو بعد وفات کا علم احادیث سے ثابت کرنا قرآن کے خلاف استدلال کیسے ہوا؟ رئیس صاحب نے خواہ مخواہ دماغ پر زور دیا اور علمی اصطلاحات کا بے محل استعمال کیا۔

فریب اور ابلہ فریبی:

یہ عنوان رئیس صاحب کا قائم کردہ ہے، اور ہمیں بھی تسلیم ہے۔ کہ فریب کہیے اور ابلہ فریبی کہیے، یا فریب کہیے اور خود فریبی گرد لیے، کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور لیکن بریلویوں کا نہیں جیسا کہ رئیس صاحب کا خیال ہے خود رئیس الاحرار صاحب ان میں سے کسی بیماری میں ضرور مبتلا ہیں۔ ثبوت ملاحظہ ہو:

مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن عظیم کی مزید آیتیں پیش کی تھیں: مثلاً:

(۱) ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾

[الأنبیاء: س ۲۱. ت ۱۰۷]

ہم نے آپ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنایا۔

(۲) ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾

[الأعراف: س ۷. ت ۱۵۶]

میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۳) ﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾

[الأحزاب: س ۳۳. ت ۶]

نبی ﷺ مسلمانوں کی جان سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔

(۴) ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ [الرحمن: س ۵۵. ت ۳. ۴]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھایا۔
پہلی اور دوسری آیت:

مولوی عبدالرؤف صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے رحمت ہونے سے انکار کیا تھا، اور ہم نے عقل و نقل سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ رحمت ہیں اور سب کے لیے رحمت و مہربان ہیں۔

مولوی رئیس احمد صاحب نے ہمارے موقف سے اختلاف نہیں کیا بلکہ جزوی تائید ہی کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

جنت ہی تو متقیوں کے لیے مخصوص ہے، ورنہ ذات رسول تو سراپا ہر کس و ناکس کے لیے رحمت ہے۔ [ابطال، ص: ۱۰۹]

بات تو صاف ہو گئی کہ ذات رسول جب ہر کس و ناکس کے لیے رحمت ہے اور مہربانی کرنے کے لیے علم بھی ضروری ہے کہ اس کس و ناکس کو آپ جانیں تب تو مہربان ہوں گے، لیکن پھر بھی بیمار یوں میں سے کسی نے زور باندھا جن کا عنوان میں ذکر ہے تو فرماتے ہیں کہ: رحمت سے مراد رسول اللہ ﷺ نہیں بلکہ جنت ہے۔ اور اس کی تائید میں مسند احمد اور تفسیر ابن کثیر اور درمنثور کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے اور قرآن عظیم کی آیت: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کا دوسرا ٹکڑا ﴿سَأَكْتِبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ﴾ نقل کیا ہے کہ اس کی رحمت کو اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لیے خاص فرمایا ہے، تو اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو ہر کس و ناکس کے لیے عام ہیں۔

لیکن مولوی رئیس صاحب یہاں ایک ایسی بات کہہ گئے جس سے خود انہیں کے دماغ میں مروڑ اٹھنے لگا کہ میں ﴿سَأَكْتِبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ﴾ سے رحمت کو خاص کر رہا ہوں۔ اور اسی آیت کا ابتدائی حصہ رحمت کو سب کے لیے عام کر رہا ہے۔ یہ تو صاف صاف متعارض ہوا۔ تو میں نے آیت کی خوب تفسیر کی کہ اول کو آخر سے متعارض کر دیا، تب طفل تسلی کے لیے فرمایا:

”واضح رہے کہ جنت کے وسیع ہونے کے باوجود متقیوں کے لیے مخصوص ہونے میں، اور رسول اللہ ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔“

[ابطال، ص: ۱۰۹]

آپ کی اس تقریر سے واضح تو کچھ خاک نہیں ہوا، البتہ یہ کھلا کہ آپ تعارض کو عدم تعارض کہنے کے آزار میں مبتلا ہیں۔ اب یہ فریب نظر ہے، یا خود فریبی؟ کون فیصلہ کرے۔

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

اللہ کے بندے ایسی رحمت جو آج سب کے لیے عام ہو اور کل متقیوں کے لیے مخصوص ہو، رسول اللہ ﷺ ہیں، کہ آج تو سب ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اٹھا رہے ہیں۔ سب کو فائدہ پہنچ رہا ہے، لیکن کل قیامت میں صرف اہل اسلام مستفید ہوں گے، اور یہی مطلب ہے قرآن کی آیت مبارکہ کا کہ آج کی عام رحمت کل مسلمانوں کے لیے خاص ہوگی۔
تیسری آیت:

تیسری آیت کے سلسلہ میں مولوی عبدالرؤف نے کہا تھا:

(۱) اولیٰ کے معنی قریب نہیں بلکہ احق بالتصرف ہیں، مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں پر خود ان سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے۔

(۲) اولیٰ کے معنی قریب ہوں تب بھی اہل سنت و جماعت کا موقف ثابت نہ ہوگا، کیوں کہ آیت کا مطلب تو ہوگا صرف مسلمانوں کے قریب، اور اہل سنت کا دعویٰ سارے عالم میں حضور کا ہے۔

ہم نے جو اب عرض کیا تھا کہ قرب جسمی پر اصرار نہیں کرتے، قرب علمی مانا جائے تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے۔ الحمد للہ کہ آپ نے سارے مسلمانوں میں تصرف کا حق مانا جس کے لیے علم کا مقدم ہونا ضروری ہے۔ اور مسلمان سارے عالم میں ہیں تو سب کا علم ثابت ہوا۔

رئیس صاحب کو اتفاق سے دو آیتیں ایسی مل گئیں جن میں لفظ اولیٰ کا ذکر ہے، بس کیا تھا آپ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی: ہرچہ پیدا می شود از دور پندارم توئی۔ اسی کو اپنی دلیل بنالیا۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ ہمارے مربی مولوی عبدالرؤف صاحب اپنی تحریر میں کیا اقرار کر کے آئے ہیں۔ چناں چہ آپ لکھتے ہیں:

اسی آیت میں: ﴿أُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ﴾

[الأنفال: س ۸، ت ۷۵]

بھی ہے تو قانون بریلو یہ کے مطابق رشتہ دار چاہے دس مختلف ممالک میں ہی کیوں نہ

ہوں، ایک دوسرے کے حالات پر حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہو جائیں۔

[ابطال، ص: ۱۰۷]

اسی طرح:

﴿ان أولى الناس بابراهيم للذين اتبعوه﴾ ہے، لہذا ہر زمانہ کے سارے مسلمان حضرت ابراہیم کے ساتھ رفیق اعلیٰ میں موجود رہ کر جنت کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔

[ابطال، ص: ۱۰۸]

ہماری گزارش ہے بندہ پروہ آپ کو زیادہ اڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کے پر تو آپ کے مربی نے پہلے ہی کتر دیے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کے لیے تصرف کا اقرار کر چکے ہیں، انہیں اختلاف صرف اس بات سے تھا کہ مسلمان ہر جگہ نہیں، اس غلط فہمی کو ”الشاہد“ میں دور کر دیا گیا، تو آپ کو مولوی عبدالرؤف صاحب کے اقرار سے آگے بڑھ کر بولنے کا کیا حق ہے؟

اور آیت مبارکہ: ﴿اولو الارحام بعضهم أولى ببعض﴾ میں باتفاق مفسرین اولیٰ کے معنی احق بالوراثت لکھے ہیں، کہ رشتہ دار ایک دوسرے کے وراثت میں زیادہ حق دار ہیں، یہاں اولیٰ کے معنی نہ اقرب بالمكان ہے نہ احق بالتصرف، پھر رشتہ داروں میں ہر ایک کے حالات کا عالم الغیب ہونے کا حکم کس طرح سے نکلے گا۔

اور دوسری آیت میں تو آپ نے غضب ہی کر دیا ہے، کیوں کہ اسی بحث میں ہم نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ آیت میں قرب سے مراد قرب جسمی نہیں ہے، اور آپ نے آیت میں قرب جسمی ہی مراد لے کر اہل سنت و جماعت کے خلاف چاند ماری شروع کر دی، اس آیت مبارکہ میں اولیٰ کے معنی اقرب فی العقیدہ ہے کہ مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عقیدہ میں زیادہ قریب ہیں، اور آپ اس کو قرب جسمی قرار دے کر الجھ رہے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے: ترجیحی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دل گیر کو کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

چوتھی آیت:

چوتھی آیت اور آیت شریفہ سورہ ”علق“ ﴿علم الانسان مالم يعلم﴾ دونوں ہی

آیتوں کی تفسیر میں مختلف مفسرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق تین تول تحریر کیے ہیں:

(۱) انسان سے مراد مطلق انسان (۲) آدم علیہ السلام (۳) حضور سید عالم ﷺ۔ اور

علم بیان سے مراد (۱) گویائی (۲) بیان اسماء اشیا (۳) بیان ماکان وما کیوں۔

مولوی عتیق الرحمن صاحب نے تیسری تفسیر کی بنیاد پر آیت کو اثبات مدعا کے لیے نقل کیا تھا۔

مولوی عبدالرؤف صاحب نے جواب میں بقیہ دو تفسیریں بھی نقل کیں اور اپنی عادت کے موافق کہا کہ آیت سے استدلال ختم ہو گیا، مزید یہ کہ مولوی عتیق الرحمن صاحب نے جو تفسیر نقل کی ہے مرجوح ہے۔

ہم نے ”الشاہد“ میں دونوں ہی باتوں کا تفصیلی جواب دیا، جس کو اصل کتاب میں دیکھا جائے۔

مولوی رئیس احمد صاحب اپنی کتاب میں ان مسائل کے بارے میں تو کوئی لب کشائی نہ کر سکے، البتہ فریب نظر میں مبتلا ہو گئے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”الشاہد“ ص: ۷۷ پر لکھا ہے کہ مولوی عتیق الرحمن صاحب نے آیت ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ سے رسول اللہ کے علم پر استدلال کیا ہے حالانکہ مولوی عتیق الرحمن صاحب نے اپنی پوری کتاب میں اس آیت کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔ [ابطال، ص: ۱۰۵-۱۰۶]

اس طرح ہم نے گویا بہت بڑا فریب دیا اور کذب بیانی سے کام لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں ہے جو کچھ ہے خود رئیس صاحب کا فریب نظر ہے۔ ہماری کتاب ”الشاہد“ موجود ہے، اس کا صفحہ ۷۷ اکھلا ہوا ہے، پورے صفحے میں کوئی بھی مولانا عتیق الرحمن صاحب کا نام دکھا دے، ہم منہ مانگا انعام دیں گے۔ مولانا عتیق الرحمن صاحب تو نہیں البتہ پورے صفحے میں دوبار فاضل رحمانی یعنی عبدالرؤف صاحب کے خطاب کا ذکر ہے۔ اور علم الانسان کی کئی تفسیروں کو بھی انہیں کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن مولوی رئیس احمد صاحب، مولانا عتیق الرحمن صاحب کے کا بوس میں کچھ ایسا مبتلا ہیں کہ اپنے مربی کی صورت میں بھی انہیں مولانا عتیق الرحمن صاحب کا ہی ہیولی نظر آیا۔ اور مولوی عبدالرؤف صاحب کو مولانا عتیق الرحمن صاحب سمجھ کر ہم پر کذب بیانی کا الزام وارد کر بیٹھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جیوں جیوں کتاب کے اختتام کی منزل قریب آتی جا رہی ہے، رئیس صاحب کی وحشت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور کیوں نہ ہوں

یہاں ہر گام گام اولیں ہے جنوں کی کوئی منزل ہی نہیں ہے
یک نہ شد و شد:

یونہی رئیس صاحب نے آیت مبارکہ ﴿وَعَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ کی تفسیر کے سلسلہ میں یہ بھی فرمایا:

”اس آیت میں انسان کو بذریعہ قلم تعلیم دینے کی تصریح ہے اور ہمارے نبی ای تھے، بذریعہ قلم آپ کو تعلیم نہ دی گئی۔“
[ابطال، ص: ۱۰۶]

گویا اس آیت میں انسان سے مراد رسول اللہ ﷺ نہیں ہو سکتے۔

مولوی رئیس صاحب نے مذکورہ بالا بات کہہ کر علم کا کیسا ستیاناس کیا ہے، ہم سے نہیں علامہ آلوسی سے سنئے:

﴿الذي علم بالقلم﴾ أي: علم ما علم بواسطة القلم، ﴿علم الانسان ما لم يعلم﴾ بدل اشتمال من ﴿علم بالقلم﴾ يعني علمه به وبدونه من الأمور الكلية والجزئية والجلية والخفية ما لم يخطر بباله. والإشعار بأنه تعالى يعلمه عليه الصلاة والسلام من العلوم ما لا يحيط به العقول ما لا يخفى. (ملخصاً)

[روح المعانی جلد ۱۶، ص: ۳۲۳]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم سے سکھایا، یعنی وہ سکھایا جو سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ علم پہلے والے علم سے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم کے ذریعہ بھی تعلیم دی اور بغیر قلم کے بھی تعلیم دی، امور کلیہ و جزئیہ روشن و مخفی، ایسے بتائے جس کی اسے خبر بھی نہ تھی۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسے ایسے علوم سکھائے جنہیں عقل جان نہیں سکتی، اور یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔

کس درجہ حیرت ناک بات ہے کہ ﴿الذي علم بالقلم﴾ علاحدہ آیت ہے اور ﴿علم الانسان ما لم يعلم﴾ الگ آیت ہے، پہلی آیت میں قلم کے ذریعہ پڑھانے کا ذکر ہے۔ اور دوسری میں بغیر قلم کے تعلیم کا ذکر ہے۔ مگر رئیس صاحب کے علم و اجتہاد کا یہ زور ہے کہ پہلے جملہ کا متعلق دوسرے جملہ کے ساتھ متعلق کر رہے ہیں۔ اس نحوی مہارت پر فراء اور سیبویہ کی روح بھی پھڑک اٹھی ہوگی۔ یہ ہے آپ کا مبلغ علم اور یہ ہے قرآن فہمی۔

اسی لیے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ اور اب تو میں یہ کہتا ہوں کہ یہ حرکت تو فریب نظر، ابلہ فریبی، اور خود فریبی سے بھی آگے کی چیز ہے۔

صدائے بر نہ خواست:

مشتبہین کے دلائل اور قرآنی تائیدات کے سلسلہ میں رئیس صاحب کی خامہ فرسائی کا حال گذشتہ صفحات میں گزرا، مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اثبات مدعی کے سلسلہ میں حدیثیں بھی ذکر کی تھیں۔ جن میں سے چند پر ہم نے ”الشاہد“ میں کلام بھی کیا تھا، اور ایک دو حدیث کا خود بھی اضافہ کیا تھا، جو مندرجہ ذیل ہیں:

((فتن جلیٰ لی کل شیء وعرفت))

تو مجھ پر ہر چیز روشن ہوگئی اور میں نے پہچان لیا۔

((إن الله رفع لي الدنيا فأنا أنظر إليها وإلى ما هو كائن فيها إلى يوم

(حلیۃ الاولیاء: ۶/۱۰۱)

القیامۃ، كأنما أنظر إلى كفي هذه))

دنیا میرے سامنے لائی گئی تو میں اس میں جو ہے اور قیامت تک ہوگا اپنے کف دست

کی طرح دیکھتا ہوں۔

((ولا تسئلونی عن شیء إلا أخبرتکم))

(مسند امام احمد: ۳/۲۰۴)

تم مجھ سے جو پوچھو گے میں اس کی اطلاع دوں گا۔

((ینخبرکم بما مضی وما هو کائن بعدکم))

(مسند امام احمد: ۳/۲۰۴)

یہ رسول تم کو گذشتہ اور آئندہ کی خبر دیتے ہیں۔

((قام فینا رسول الله ﷺ مقاماً فأخبرنا عن بدأ الخلق حتی دخل

أهل الجنة منازلهم وأهل النار منازلهم، حفظ ذلك من حفظ، ونسي من

(صحیح مسلم: کتاب الفتن ۲/۳۹۰)

(نسیہ))

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر ابتداء خلق سے دخول جنت و نار تک کی

خبریں دیں، تو جو یاد رکھ سکا اس کو اس نے یاد رکھا، جو بھول گیا بھول گیا۔

ان سب حدیثوں پر مولوی عبدالرؤف صاحب نے جو کہا، اور ہمارے معروضات دونوں ہی ”الشاہد“ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن رئیس التحریر صاحب کا قلم اس موضوع پر بالکل دم بخود ہے۔ صرف یہ ایک جملہ سرزد ہوا ہے کہ ان کا جواب فاضل رحمانی اور علمائے حق تحقیق سے دے چکے ہیں۔ اس لیے ہم بھی کچھ مزید چھیڑنے کے بجائے اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہم بھی آپ کے علمائے حق کی تحقیق کی پوری پوری داد دے چکے ہیں اور آپ کی خاموشی کے لیے بھی ایک شعر نذر ہے:

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے پسینہ پونچھیے اپنی جبین سے

متفرقات:

مولوی رئیس احمد صاحب نے اپنی کتاب ”ابطال شواہد الشاہد“ میں کچھ ضمنی مسائل سے بھی تعرض کیا ہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے تاکہ بعد کو کچھ گلہ شکوہ نہ رہ جائے۔

کتاب التوحید، اور تقویۃ الایمان:

۱۲۳۴ھ تک محمد ابن عبد الوہاب (۱۱۱۱ھ ۱۲۰۶ھ) نجدی کی تحریک ایک مسلمہ گمراہی تھی، اور دنیاے اسلام ان کی بد مذہبی اور بد دینی کے بارے میں متفق اللسان تھی۔ مولوی اسماعیل دہلوی ۱۱۹۳ھ ۱۲۴۶ھ کی تحریک ودعوت بھی لگ بھگ انہیں خطوط پراٹھی اور آگے بڑھی، اس لیے ہندوستان میں عام طور پر علمائے اہل سنت نے ان کی تحریک کا تعارف کراتے ہوئے یہ ذکر کیا کہ مولوی اسماعیل دہلوی کی کتاب ”تقویۃ الایمان“ تو ابن عبد الوہاب نجدی کی ”کتاب التوحید“ کا ترجمہ ہے، خود مولوی اسماعیل صاحب کے چچیرے بھائی مولانا مخصوص اللہ فرماتے ہیں: ”چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی کار سالہ متن تھا، یہ شخص گویا اسی کی شرح کرنے والا ہو گیا۔“

(اسماعیل اور تقویۃ الایمان، ص: ۱۰۲)

ظاہر ہے کہ علمائے اہل سنت کی اس بات کا مطلب یہ نہیں تھا، کہ یہ کتاب ابن عبد الوہاب کی تحریک کا لفظی ترجمہ ہے، کیوں کہ ان کا مقصد تقویۃ الایمان کی تاریخی حیثیت کا تعین نہیں تھا۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کتاب کی گمراہی کتاب التوحید کی ضلالتوں کا پس خوردہ ہے اور مقصد کے اظہار کے لیے لفظی ترجمہ یا ترجمانی دونوں ہی طرح سے ان دونوں کتابوں کے اصلاً ایک

ہونے کی بات صحیح ہے۔

مولوی اسماعیل دہلوی کے متبعین اور خواہاؤں نے صرف اتنی سی بات پر آسمان سر پر اٹھالیا۔ یہ سنی مولوی غلط کہتے ہیں ”تقویۃ الایمان“ کتاب التوحید کا ترجمہ نہیں ہے۔ یہ جاہل ہیں کاذب ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ دیوبندی صاحبان کا بھی یہی وظیفہ ہے۔ اور غیر مقلد حضرات کا بھی، مولوی رئیس احمد صاحب نے بھی اپنے بڑوں کے راگ میں اپنا سر ملایا ہے۔ اور مولوی عتیق الرحمن صاحب کو کاذب اور جاہل قرار دیا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

”ایک لغو طرازی یہ بھی ہے کہ اس بیسویں صدی میں یہ لوگ کہتے رہتے ہیں کہ حضرت اسماعیل شہید کی بدعت شکن کتاب تقویۃ الایمان شیخ الاسلام محمد ابن عبد الوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں عام طور سے ملتی ہیں۔ ہر صاحب علم دونوں کتابوں کا مطالعہ کر کے باسانی معلوم کر سکتا ہے، کہ بریلوی جماعت نے تقویۃ الایمان کو کتاب التوحید کا ترجمہ قرار دے کر یا تو نادانی یا جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ یا کذب بیانی میں اپنی فن کاری دکھلائی ہے۔“

[ابطال، ص: ۱۲]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس صاحب کی دعوت پر لبیک کہا جا چکا ہے اور خانقاہ شاہ ابوالخیر دہلی کے موجودہ دینی سربراہ ابوالحسن زید فاروقی ازہری صاحب جو اپنے کو غیر جانب دار کہتے ہیں، اور جن کے اہل علم ہونے سے بھی رئیس صاحب کو انکار نہ ہوگا۔ ان دونوں کتابوں کا تحقیقی مطالعہ کر کے جو فیصلہ دے دیا ہے اس کا خلاصہ ہم بیان کرتے ہیں۔ اصل متن ان کی کتاب مولانا اسماعیل اور تقویۃ الایمان میں دیکھا جائے۔ خدا نے چاہا تو رئیس صاحب اور ان کے طائفہ کے لیے بھی سرمہ بصیرت ثابت ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

”محمد ابن عبد الوہاب نے ایک مفصل کتاب ”کتاب التوحید“ کے نام سے تحریر کی۔ ۷ محرم ۱۲۲۱ھ میں طائف پر قبضہ کرنے کے بعد اہل مکہ کے پاس اسی مطول کتاب کا خلاصہ اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ اسی کا خلاصہ ہے، بھیجا۔ یہ مختصر رسالہ سارے عالم میں پھیلا اور دلی میں بھی شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہی پہونچا۔ مولوی اسماعیل دہلوی نے اس کو ٹھوڑی رد و بدل کے بعد اردو میں ”تقویۃ الایمان“ کے نام سے مشہور کیا، اور ہر طرح تقویۃ الایمان شیخ نجدی کے اسی رسالہ کا چر بہ ہے، جس کا ثبوت مندرجہ ذیل ہے:

(۱) نجدی نے یہ لکھا ہے کہ میرا یہ رسالہ دو باب پر مشتمل ہے، تو صاحب تقویۃ الایمان نے بھی اپنی کتاب کے دو ہی باب قرار دیے، لیکن مکمل صرف ایک ہی باب کر سکے، کیوں کہ نجدی نے بھی اپنے رسالہ مرسلہ ۷ محرم ۱۲۲۱ھ میں کتاب صرف ایک باب پر ہی ختم کر دی تھی۔

(۲) نجدی نے اپنی کتاب میں فصول کے جو نام رکھے، مولوی اسماعیل دہلوی نے بھی وہی نام رکھے بلکہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوگی کہ کتاب اردو میں اور فصل کے نام عربی۔ شاید جلدی میں ناموں کا ترجمہ نہ کر سکے۔

(۳) نجدی نے اپنی کتاب میں کل ۲۶ آیات قرآنی تحریر کی تھیں، ان سے ۱۲۲ اسماعیل صاحب نے بھی اختیار کیں۔

(۴) جن آیات اور جن بیانوں سے نجدی نے ابتدا کی تھی، بالکل وہی طریقہ اسماعیل صاحب نے تقویۃ الایمان میں برقرار رکھا۔

(۵) اور انداز بیان میں بھی کہیں نجدی پر سبقت کہیں برابری اور کہیں کچھ کمی ہے۔

(۶) بعض بعض مقامات پر حیرت ناک حد تک لفظی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔

ناظرین انصاف فرمائیں کہ اتنی مشابہتوں کے بعد بھی یہ کہنا کہ غلط ہے کہ تقویۃ الایمان کی اصل کتاب التوحید ہے؟ اور چوں کہ یہی مطلب لفظ ترجمہ بول کر ادا کیا گیا ہے، اس لیے جہالت اور دروغ گوئی سے کام لیا گیا؟

ناظرین سے ہماری گزارش ہے کہ حضرت زید صاحب کی کتاب مذکور میں ان کا اصل بیان ضرور پڑھا جائے، تاکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے کہ بیسویں صدی کے اجالے میں علمائے اہل سنت لوگوں کی آنکھ میں دھول جھونک رہے ہیں یا رئیس صاحب جیتی مکھی نگل رہے ہیں۔

نجد و عراق:

محمد ابن عبد الوہاب نجدی کے چار حانہ عقائد، مفسدانہ تحریک، اور ظالمانہ اعمال نے پورے عالم اسلام میں ایک آگ لگا رکھی تھی۔ دنیاے اسلام کے اطراف و اکناف سے ۲۶ علمائے اسلام نے ان کا رد تحریر کیا، خود ان کے بھائی علامہ سلیمان ابن عبد الوہاب نجدی نے بے حد مکمل و مدلل رد فرمایا۔

[کتاب مذکور، ص: ۳۳۲ تا ۳۴۳]

مکہ مکرمہ کے تمام علمائے کرام ہر چہار مذہب کے قاضی اور مفتی اور تمام دنیا سے آئے ہوئے حجاج علمائے ۱۲۲۱ھ کو بوقت نماز عصر بالاتفاق نجدیوں کے کفر کا فتویٰ دیا اور ان کے ساتھ جہاد لازم گردانا۔ [کتاب مذکور ص: ۲۰، وقتہ وہابیہ]

اور ان پر آخری مہر مفتی دیار شام حضرت علامہ ابن عابدین نے اپنی شہرہ آفاق کتاب حاشیہ رد المحتار میں لگائی۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”کما وقع في زماننا في اتباع عبد الوهاب الذين خرجوا من نجد، وتغلبوا على الحرمين، واستباحوا بذلك قتل أهل السنة وقتل علمائهم، حتى كسر الله شوكتهم، وخرب بلادهم، وظفر عليهم عساكر المسلمين. عام ثلثة وثلثين ومأتين وألف.“

ہمارے زمانہ میں محمد ابن عبد الوہاب کے متبعین سے ایسا واقع ہوا کہ انہوں نے نجد سے خروج کیا، اور حرمین شریفین پر غالب آ گئے، تمام اہل سنت اور ان کے علما کے قتل کو حلال گردانا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شوکت توڑی اور ان کے شہروں کو برباد کیا، اور ان پر اسلامی لشکر کو ۱۲۳۳ھ میں فتح دی۔

خود ہندوستان میں غیر مقلدین کے پشت پناہ نواب صدیق حسن خاں نے (ترجمان وہابیہ) دارالعلوم دیوبند کے دو سابق صدور مولوی انور شاہ کشمیری (فیض الباری) اور مولوی حسین احمد (شہاب ثاقب) نے اور شیخ الہند خلیل احمد دیوبندی نے (تصدیقات) میں اس ظالم اور مفسد گروہ کی دل کھول کر مذمت کی۔ مختصر یہ کہ اس ظالم گروہ کی چہرہ دستیوں سے دنیا کی پوری کلمہ گو برادری تملٹلا اٹھی اور بقول سوداویہ حال ہو گیا کہ:

ناوک نے تیرا صید نہ چھوڑا زمانہ میں تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

پورے عالم اسلام کے دلوں میں اس نوزائید فرقہ کے خلاف اس درجہ نفرت اور تحقیر بھر

گئی کہ اہل اسلام سے ممتاز کرنے کے لیے ان کا ایک علاحدہ نام وہابی رکھا گیا۔

غور کیا جائے تو اس لفظ کے ظاہر و باطن میں کوئی خرابی نہیں، اور جس مقدس نسبت کا اس سے اظہار ہوتا ہے، وہ تو ایمان کی جان ہے، مگر اس نو مولود فرقہ کی عملی اور اعتقادی آلودگیوں نے اس مبارک لفظ کو اس درجہ آلودہ کیا کہ پورے عالم اسلام میں اب یہ ایک گالی بن کر رہ گیا ہے، حد

یہ ہے کہ کسی بھی متبع ابن عبد الوہاب کو آپ اس لقب سے مخاطب کر کے دیکھ لیجیے تلملا اٹھے گا، اور ان لوگوں کے خلاف اول فول بکنے لگے گا، جنہوں نے اسے یہ خطاب دیا۔ حالاں کہ انہیں بنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ خود لفظ میں کوئی غلاظت نہیں ہوتی۔ الفاظ کو غلیظ روپ دینے والا تو متعلق افراد کا کردار ہوتا ہے۔ دیکھیے لوط کا لفظ کس درجہ پیارا ہے لیکن متعلق قوم کے غلیظ کردار نے اس کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس سے بنے ہوئے ایک لفظ کو شرفا زبان پر لانا بھی ناپسند کرتے ہیں، اسی طرح یہ لفظ وہابی بھی ایک سیدھا سادہ کلمہ ہے جس کو ابن عبد الوہاب اور ان کے متبعین کے ظالمانہ کردار نے آلودہ کر کے رکھ دیا ہے۔

الغرض جس قوم کے خلاف جمیع اہل اسلام کے دلوں میں اس درجہ نفرت بھری ہوئی تھی، ان کی گمراہیوں کو طشت از بام کرنے کے لیے علمائے عرب و عجم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اور غالباً سب سے پہلے محمد ابن عبد الوہاب کے بھائی سلیمان ابن عبد الوہاب نے احادیث مبارکہ سے اس فرقہ کی ایک مکمل تصویر کھوج نکالی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کا مخاطب کر کے کہتے ہیں: ”اور جو چیز آپ کے مذہب کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے صحیحین کی حدیث جو ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ کفر کا سر مشرق کی طرف ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایمان یمنی ہے، اور فتنہ مشرق کی طرف ہے، جہاں سے شیطان کا سینک نکلے گا۔ اور اسی میں ابن عمر سے کہ سرکار نے مشرق کی طرف رخ کر کے فرمایا: کہ فتنہ ادھر ہے۔ اور بخاری شریف میں یہ حدیث مرفوع کہ آپ نے دعا فرمائی، یا اللہ ہمارے شام اور یمن میں برکت دے۔ آپ نے دو دفعہ ایسا فرمایا تو کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے نجد کے لیے بھی برکت ہو، تو تیسری بار بھی آپ نے شام و یمن کے لیے دعا کر کے فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہیں اور وہیں شیطان کا سینک نکلے گا۔ اور امام احمد نے بھی ابن عمر سے مرفوعاً روایت کی: یا اللہ ہمارے مدینہ میں برکت دے۔ ہمارے ”صاع“ میں برکت دے، ہمارے ”مد“ میں برکت دے، ہمارے شام و یمن میں برکت دے، پھر مشرق کی طرف رخ کر کے فرمایا: وہاں شیطان کا سینک نکلے گا، وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سچے ہیں۔ آپ نے امانت ادا کر دی۔ رسالت پہونچادی۔ تقی الدین سبکی نے فرمایا: مدینہ سے پورب علاقہ مشرق ہی ہے جہاں قبیلہ بنو تمیم کا جھوٹا مدعی نبوت مسیلمہ کذاب نکلا۔ یہ سب سے پہلا فتنہ تھا جو رسول اللہ ﷺ

کے بعد مشرق سے ظہور پذیر ہوا۔ اور خلیفہ اول نے ان لوگوں سے جہاد کیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ فتنہ حاضرہ شیخ محمد ابن عبد الوہاب کا دست راست امیر محمد بن سعود بھی میلہ کذاب کے خاندان بنو حنیفہ کا تھا اور خود شیخ نجد بھی بنو تمیم ہی سے تھے۔

ان احادیث میں آپ کے مذہب کے بطلان کے بہت سے اشارے ہیں:

(۱) آپ ﷺ نے بار بار ایمان کو یمنی بتایا۔ اور مشرق کو فتنہ گاہ بتایا اور آپ لوگ فتنہ بھی

ہیں اور مشرقی بھی ہیں۔

(۲) حضور ﷺ نے حجاز اور اہل حجاز کے لیے بار بار دعا فرمائی اور ”ما من فتنہ“ ہونے

کی وجہ سے مشرق خصوصاً نجد کے لیے دعا سے انکار کیا۔ (تو حضور ﷺ کی دعا سے اہل نجد کی محرومی معمولی محرومی نہیں ہے۔ اور مختلف اسلامی علاقہ میں سے خاص اس علاقہ کو کفر و فتنہ کی آماجگاہ کی حیثیت سے منتخب کرنا۔ اور اس نشان دہی کے بعد آپ لوگوں کا اہل حجاز، اہل یمن کو کافر کہنا۔ ضرور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے۔)

[الصواعق اللہیہ، ص: ۴۳-۴۴]

احادیث کریمہ کے اس تعارف کے بعد نجدی تحریک اور اس کے شیخ کی جو بھیانک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، اہل نظر پر مخفی نہیں، اور اس صورت حال سے نجدی صف میں اضطراب بھی ایک امر واضح ہے، اس لیے اپنے شیخ سے شیطان کا سینگ ہونے کا الزام دور کرنے کے لیے پوری جماعت نے ان حدیثوں میں طرح طرح کی تاویلیں کیں۔ چنانچہ بعض وہابیوں کا خیال ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر مشرق کی طرف ہاتھ اٹھایا، منبر سے ٹھیک مشرق کی طرف حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہے۔ اس لیے اشارہ اسی طرف ہوا، اور زلزلوں اور فتنوں سے مراد ام المؤمنین کا وہ اقام ہے، جو جگہ جمل میں ہوا۔

معاذ اللہ اس دریدہ دہن نے اپنے شیخ کی حمایت میں آرام گاہ رسول کو بھی نہیں چھوڑا، اہل بیت طاہر اور السیدۃ والنقیۃ الزاہدہ ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی نہیں بخشا۔ اس آلودہ فطرت کو یہ بھی نظر نہیں آیا کہ حدیث شریف میں فرمایا: کفر کا سر مشرق کی طرف ہے۔ تو کیا اس گندہ ذہن کے نزدیک ام المؤمنین کا یہ اقام کفر ہے۔

اس نے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ حضور ﷺ نے صرف مشرق کا ہی ذکر نہیں کیا ہے، شام اور یمن اور مدینہ کے لیے برکت کی دعا بھی کی ہے، تو کیا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سارا مدینہ تو قابل برکت تھا اور خود آپ کا گھر اس سے خالی تھا، جب کہ اہل بیت کے لیے خود ہمیشہ اور امت کو بھی قیامت تک دعائے برکت کے لیے حکم فرما گئے: اللھم بارک علی محمد وعلی آلہ محمد۔

اور اس کو یہ بھی تو نظر نہیں آیا کہ حضور ﷺ کا یہ اشارہ ایک سوال کے جواب میں تھا جس میں اہل نجد کے لیے دعا برکت کی درخواست کی گئی تھی، اور آپ نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے، وہاں شیطان کا سینکا ہوگا۔ تو جب سوال نجد سے تھا تو جواب حجرے کے لیے کیسے ہو گیا؟ یہ ایک عام اصول ہے۔ السؤال معاد فی السؤال۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

(۲) بعض نے کہا حضور ﷺ نے مشرق کی طرف اشارہ کیا، نجد مدینہ کے مشرق میں نہیں ہے، ٹھیک مشرق میں تو عراق ہے۔ اور بلاشبہ عراق سے قتل اہل بیت کا فتنہ عظیم برپا ہوا، مجھے خوب یاد ہے کہ میرے زمانہ طالب علمی میں الفقیہ امرتسر میں مدتوں یہ بحثیں چلیں۔

اس تاویل کے موجد نے بھی اپنی عقیدت کے جوش میں احادیث کریمہ کی روایت سے قطع نظر کر لیا، ورنہ عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو دست گرامی کے اشارہ سے اس فتنے کی سمت متعین کی اور دوسری طرف زبان مبارک سے نام لے کر مخصوص جگہ کی تعیین بھی کر دی۔

پھر یہ امر بھی خلاف واقعہ ہے کہ نجد مدینہ شریف سے مشرق کی طرف نہیں ہے، اس کی تکذیب جزیرۃ العرب کا جغرافیہ کر رہا ہے۔

(۳) ان دونوں تاویلوں کی سخافت سے شرمندہ ہو کر بعض نے یہ تاویل کی:

”صحیح حدیث میں نجد کا لفظ آیا ہے مگر اس سے مراد نجد کے اصطلاحی معنی (عرب کا ایک خاص صوبہ) نہیں، بلکہ لغوی معنی سطح مرتفع مراد ہے، عرب میں نجد کے لفظ سے حجاز کے مقابل وہ بالائی حصہ مراد لیا جاتا ہے جو عراق تک چلا جاتا ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں لفظ نجد سے بلند زمین مراد ہے۔ اور وہ عراق ہے، اور وہیں زلزلے اور فتنے پیدا ہوئے اور بعض نے تو یہ زیادتی

کی کہ کوفہ کے علم و اجتہاد کو فتنہ قرار دے دیا۔ لعنة الله على الكاذبين۔

لیکن یہ تاویل بھی سابقہ تاویلوں کی طرح مردود نامقبول ہے۔ اولاً حدیث میں شام و یمن کے الفاظ ہیں، اور ایک روایت میں مدینہ کا ذکر بھی ہے۔ تو کیا ان الفاظ کا بھی ترجمہ ہی مراد لیا جائے گا اور اصطلاحی معنی مراد نہ ہوں گے، اگر حدیث میں ان الفاظ سے وہ خاص مقامات مراد ہیں جن کے ساتھ وہ مشہور ہیں تو لفظ نجد سے وہ خاص علاقہ کیوں مراد نہ ہوگا جو اسی نام کے ساتھ معروف و مشہور ہے۔ یہ کیا زیادتی ہے، ابن سعود خود اپنے کو امیر نجد کہے۔ تو اس سے مراد صوبہ نجد ہوا، ساری دنیا اربع عبد الوہاب کو شیخ نجدی کہے تو اس سے مراد صوبہ نجد ہوگا، اور حدیث شریف میں یہی نجد کا لفظ آگیا تو وہاں صوبہ نجد نہیں بلکہ اونچی زمین مراد ہے؟۔

ثانیاً: لغوی معنی مراد لے کر زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ نجد کی وسعت میں عراق بھی شامل ہو گیا۔ خود نجد لغوی معنی سے نکل گیا، اس پر کیا دلیل؟ کیا نجد اس بالائی حصہ میں شامل نہیں جس میں عراق کو زبردستی لغوی معنی کا سہارا لے کر داخل کیا گیا ہے۔ عرب کے جغرافیہ طبعی میں تو یہ تین قسمیں بتائی گئی ہیں: ”تہامہ“ ترائی کا علاقہ ”نجد“ بالائی حصہ ”حجاز“ ان دونوں کے درمیان کا حصہ۔ تو گویا نجد کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہ تہامہ کے مقابلہ میں جزیرہ کا بالائی حصہ ہے، پھر یہ عراق کے نجد میں شامل ہونے کے بعد خود کیسے نکل جائے گا؟ اس تاویل سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ نجد کی طرح عراق بھی فتنوں اور زلزلوں کی زمین ہے۔ اور اس سے کسی کو انکار نہیں۔

الغرض تاویل کے سلسلہ میں ہوا خواہان نجد کی ساری دراز لسانیاں رائگاں ہی گئیں، اور بات کچھ بگڑی ہے ایسی کہ بنائے نہ بننے والا معاملہ ہے۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ فتنہ و جال اور فتنہ خوارج کی طرح فتنہ نجد بھی ایک نامزد گمرہ ہی ہے۔ کہ خود زبان نبوت نے ہی جس کا حال بیان کر دیا ہے۔

مولانا مفتیق الرحمن صاحب نے بھی کہیں وہی حدیث نجد لکھ دی تھی۔ اس پر مولوی رئیس احمد صاحب کو ایسا طرارہ آیا کہ آپ نے ایک عنوان قائم کر دیا ”عراق و نجد کی بحث“ اور ایک حدیث فتح الباری سے نقل کی، صحابہ نے عراق کے لیے دعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا: نہیں وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے۔ اور اخیر میں ٹیپ کا بند لگایا کہ اہل علم حدیث میں

آئے ہوئے لفظ نجد سے عراق مراد لیتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔“

سبحان اللہ یہی کیوں صحیح ہے۔ صحیح ہونے کے دلائل کیا ہیں؟ یا صرف اس لیے صحیح ہے کہ آپ نے کہہ دیا، کہ ع: مستند ہے میرا فرمایا ہوا، یا اس لیے صحیح ہے کہ آپ کے شیخ کے چہرے کی سیاہی اس سے دھل رہی ہے۔ وہ کون اہل علم ہیں جو خلاف قرینہ لفظ نجد سے عراق مراد لے رہے ہیں، علمائے اسلام نے تو ان احادیث سے بھی جس میں نجد کا لفظ نہیں آیا ہے صرف مشرق کا ہی لفظ ہے، اسی لفظ سے نجد اور شیخ نجد ہی مراد لیا ہے۔

حضرت سلیمان ابن عبد الوہاب نجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقریر اور پر گزری، حضرت علامہ احمد بن زینی دحلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بیان سنئے:

”رسول اللہ ﷺ نے ان خوارج کی خبر متعدد وحدیثوں میں دی ہے، اور یہ حدیثیں اخبار بالغیب ہونے کی وجہ سے دلائل نبوت میں شمار ہوں گی۔ حدیثیں سب صحیح ہیں کچھ تو صحیح بخاری و مسلم میں ہیں اور کچھ دوسری کتابوں میں ہیں۔“

(۱) رسول اللہ ﷺ نے مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: فتنہ یہاں سے ہوگا۔

(۲) حضور ﷺ نے فرمایا: کچھ لوگ مشرق سے خروج کریں گے، وہ قرآن پڑھیں گے جو ان کے حلق کے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے ہی نکل جائیں گے، جیسے تیر نشانہ سے، وہ دین میں لوٹیں گے بھی نہیں تا آن کہ تیر اپنے فوق کی طرف لوٹے، ان کی علامت یہ ہوگی کہ وہ سر گھٹائیں گے۔

(۳) میری امت میں اختلاف وجدائی ہوگی، کچھ لوگ ہوں گے کہ باتیں اچھی کریں گے عمل ان کا خراب ہوگا، ان کا ایمان حلق کے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین میں واپس نہ ہوں گے چاہے تیر اپنے فوق کی طرف لوٹے، وہ ساری مخلوق سے برے ہوں گے، جس کو وہ قتل کریں گے اس کے لیے خوش خبری اور جو انہیں قتل کرے اس کے لیے بھی خوش خبری، وہ کتاب اللہ کی طرف بلائیں گے مگر اس پر خود عمل نہیں کریں گے، جو انہیں قتل کرے وہ خدا کا قریبی ہوگا۔ ان کی نشانی سر گھٹانا ہوگی۔

اس کے بعد تین حدیثیں اس مضمون کی نقل کی ہیں:

(۴) حضور ﷺ نے فرمایا: کفر کی جزا مشرق کی طرف ہے، اور فخر اور تکبر گھوڑا پالنے

والوں میں ہے۔

(۵) حضور ﷺ نے فرمایا: مشرق کی طرف سے فتنے آئیں گے۔

اس کے بعد نجد والی حدیث روایت کی:

(۶) حضور ﷺ نے فرمایا: سخت دلی اور ظلم مشرق میں ہے اور ایمان اہل حجاز میں ہے۔

(۷) حضور ﷺ نے فرمایا: کچھ لوگ مشرق کی طرف سے نکلیں گے قرآن ان کے حلق

کے نیچے نہیں اترے گا۔ حالاں کہ ہر دم پڑھیں گے، ان کی جب ایک نسل ختم ہوگی تو دوسری ان کی جگہ لے لی۔ ان کی آخری جماعت دجال کی ساتھی ہوگی۔

حضور ﷺ نے ان کی یہ علامت جو بیان کی ہے کہ وہ سر گھٹائیں گے۔ یہ وہابیوں کے

علاوہ کسی گمراہ فرقہ میں نہیں پائی جاتی کہ انہیں کو اس پر اصرار تھا، اور ان کی جماعت میں داخل

ہونے والے فوراً سر گھٹانے پر مجبور کرتے، یہ حدیث ان کے بارے میں صریح پیش گوئی

ہے۔ اس لیے سید عبد الرحمن اہل مفتی زبیدہ فرماتے ہیں کہ ان کے رد میں کتاب لکھنے کی

ضرورت ہی نہیں، کیوں کہ یہ حدیث ہی ان کے رد کے لیے کافی ہے۔

[الدرر السنیہ، ص: ۳۹-۵۰]

دیکھیے ان گیارہ حدیثوں میں صرف ایک میں نجد کا لفظ ہے، بقیہ بیشتر حدیثوں میں

صرف مشرق کا لفظ ہے، اور ان سب حدیثوں کو حضرت علامہ زینی دحلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابن

عبد الوہاب اور ان کے کارناموں کے بارے میں پیش گوئی قرار دے رہے ہیں۔ پس رئیس

صاحب کا خاص لفظ نجد کے بارے میں عقل و نقل کے خلاف حیلہ حوالہ کرنا ان کے شیخ کے لیے کیا

مفید ہوگا؟۔

قصہ اصل یہ ہے کہ صوبہ نجد کی ایک وادی حنیفہ اور وہاں کے قبائل بنو تمیم اور حنیفہ عہد

رسالت سے ہی اسلام کے لیے فتنوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، ذوالحویہ مصرہ مشہور منافق نجد

کے قبیلہ بنو تمیم ہی سے تھا۔ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب اور منکرین زکاۃ کا فتنہ وادی حنیفہ کے خاص

مقام عیینہ سے بپا ہوا۔ اب گیارہ سو سال کے بعد ابن عبد الوہاب بھی اسی صوبہ نجد اسی مخصوص

وادی بلکہ مسیلمہ کذاب کی جاے پیدائش مقام عیینہ سے اٹھا۔ تو لامحالہ علمائے اسلام کا ذہن ان

احادیث اور پیشین گوئیوں کی طرف جانا ایک فطری امر تھا، جو زبان نبوت سے اس علاقہ اور اس

قوم کے بارے میں بیان ہو چکی تھیں۔

اب رئیس صاحب اور ان کے ہم مذہبوں کا اس کے خلاف واویلا بے کار و عبث ہے۔ وہ بے چارے کس کس چیز کی تاویل کریں گے۔ ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بنو تمیم اور ذوالخویصرہ کی قوم سے ہونے کا ذکر کیا، ابن عبد الوہاب بنو تمیم سے ہیں، ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے مشرقی ہونے کی علامت قرار دی، یہ مشرقی بھی ہیں، حضور ﷺ نے ان کے لیے نجدی ہونے کی باء کہی، یہ خود اپنے منہ سے اپنے کو نجدی کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سرگھٹا نا ان کا شعار بتایا۔ یہ وہابی عورتوں کے بھی سرگھٹانے پر اصرار کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فسادی قرار دیا۔ بلاشبہ صرف اور صرف اسلام کے خون سے ان کے دامن رنگین ہیں۔

پس رئیس صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ صبر فرمائیں، خود زبان نبوت نے ہی شیخ نجدی کی قسمت پر مہر لگادی۔

زآب کوثر زمزم سفید تنواں کرد گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ
رئیس صاحب نے ایک بات اور بھی کہی ہے:

”کیا بریلویوں کے نزدیک جس طرح نجدی ہونے کی بنا پر شیخ الاسلام محمد ابن عبد الوہاب مستحق طعن و تشنیع ہیں اسی طرح عراقی ہونے کے سبب امام اعظم ابو حنیفہ اور شیخ عبد القادر جیلانی بھی مستحق طعن و تشنیع ہوں گے۔“
[ابطال، ص: ۱۲]

ہماری گزارش ہے کہ ہم سارے نجدیوں کو کہاں مورد لعن و طعن قرار دیتے ہیں، اور احادیث نبوی کا مورد گردانتے ہیں، آخر شیخ نجدی کے والد عبد الوہاب نجدی کو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے بھائی سلیمان بن عبد الوہاب کو ایک راسخ العقیدہ عالم دین کہہ کر ہم لوگ ہی یاد کرتے ہیں۔ ابن عبد الوہاب کا انتخاب تو ان کی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس طرح عراق کی پیش گوئیوں کے مورد ابن سعد، شمر ذی الجوشن اور مختار ابن عبید بھی اپنے غلط کارناموں کی وجہ سے قرار دیے گئے۔

پس آپ کا الزام تو جب صحیح ہوتا کہ نجدی ہونے کے ناطے یک لخت تمام باشندگان نجد کو ہم مورد طعن گردانتے، رئیس صاحب! جس طرح لفظ وہابی بے حد مبارک لفظ ہے، لیکن ابن

عبدالوہاب نے اس کی مٹی پلید کی، اسی طرح نجد کی مٹی کا کوئی قصور نہیں یہ درگت تو آپ کے شیخ کی بدولت ہوئی ہے۔

ابلیس کی طرف سے ایک غلط توجیہ:

ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو کیوں سجدہ نہیں کیا، قرآن نے اس بارے میں ایک

جگہ فرمایا: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ﴾ [البقرة: س ۲. ت ۳۳]

شیطان نے سجدہ سے انکار کیا اور تکبر کیا۔

دوسری جگہ قرآن عظیم میں آیا:

﴿قَالَ لَمْ أَكُنْ لَأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾

[الحجر: س ۱۵. ت ۳۳]

میں آدمی کو سجدہ نہیں کروں گا جو کھنکھاتی مٹی سے بنایا گیا۔

مولوی عتیق الرحمن صاحب نے ”خیر الانبیاء“ میں تحریر کیا کہ شیطان نے اس دلیل سے

کہ غیر خدا کو سجدہ جائز نہیں سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے، آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔

مولوی رئیس صاحب نے خیر الانبیاء کے اس بیان کو رد کرنے کے لیے مذکورہ بالا عنوان

قائم کیا، عنوان میں تو اس توجیہ کو غلط کہا۔ اور تفصیل میں ایک زینہ نیچے اترے کہ یہ قرآنی تصریح

کے خلاف ہے، حالاں کہ نہ تو یہ غلط ہے نہ قرآنی تصریح کے خلاف ہے، غلط تو اس لیے نہیں کہ یہی

توجیہ شیطان کی طرف حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی منسوب کی ہے۔ تذکرۃ

الاولیاء للعطاری میں ہے:

”آپ (حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ) کی ملاقات مسجد کے دروازہ پر ایک معمر

شخص کی صورت میں ابلیس سے ہو گئی، تو آپ نے سوال کیا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ

کرنے کی کیا وجہ تھی، اس نے جواب دیا غیر اللہ کو سجدہ کب روا ہے، اس جواب سے آپ حیرت

زدہ ہو گئے شبی آواز آئی اس سے کہہ دو تو کاذب ہے، کیوں کہ بندے کو مالک کے حکم سے انحراف

کی اجازت نہیں۔ [تذکرۃ الاولیاء ص: ۱۹۵۔ تذکرۃ جنید بغدادی]

ہماری گزارش یہ ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے پورے عالم اسلام کے ایک مسلمہ

بزرگ نے یہی توجیہ بیان فرمائی، آج مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اسی کو تحریر فرمادیا تو یہ بات

غلط کس طرح ہوئی؟ ہاں رئیس صاحب سے یہ بھی بعید نہیں ہے کہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کو جھٹ سے بریلوی کہہ دیں۔

اور خلاف قرآن اس لیے نہیں کہ قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ تکبر کے علاوہ اور کوئی وجہ نہ تھی۔ بالفرض اگر کوئی اور وجہ قرآن میں مذکور نہ ہوتی تب بھی عدم ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں تو دوسری آیت میں جو وجہ مذکور ہے اس سے صاف یہی مفہوم وہور ہا ہے کہ انکار سجدہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے آدم علیہ السلام کو اس لیے سجدہ نہیں کیا کہ وہ خدا نہیں تھے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿لَمْ أَكُنْ لَأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ﴾

[الحجر: س ۱۵، ت ۳۳]

میں کھنٹی مٹی سے پیدا کیے ہوئے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا۔

اس آیت نے انکار سجدہ کو دو وصفوں پر محمول کیا ہے، پس بطور مفہوم مخالف اس کا یہ مطلب ضرور ہوگا کہ میں بشر کو نہیں خدا کو سجدہ کروں گا، اور یہ وہی شیطانی توحید ہے جس کا ذکر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اور جس کو مولوی عتیق الرحمن صاحب نے بیان کیا، لیکن ہمارے رئیس صاحب کی بیماری یہ ہے کہ انہیں پڑھنے لکھنے سے کم مطلب ہے بریلویوں پر لعن طعن اور سب و شتم سے زیادہ غرض ہے۔ اسی سلسلہ میں دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ:

یہ بات کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ جس طرح ابلیس نے مٹی کے بنے ہوئے بشر کو ذلیل سمجھا اسی طرح بریلویوں کا بھی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام بالخصوص خاتم المرسلین کو بشر کہنے سے ان کی تحقیر اور تذلیل ہوتی ہے۔ [ابطال، ص ۱۴]

اس مسئلہ میں بھی رئیس صاحب سے گزارش ہے کہ: ع

خن شناس نئی دلبر اخطا بجاست

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ وعظ و نصیحت کے وقت اگر کوئی بات کسی صحابی کے سمجھ میں نہ آتی تو عرض کرتا: راعنا یا رسول اللہ اے اللہ کے رسول ہماری رعایت کیجیے، یہودیوں نے یہی کلمہ سرکاری توہین کی نیت سے کہنا شروع کیا تو حکم قرآنی ہوا:

﴿لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

[البقرة: س ۲، ت ۱۰۴]

اے مسلمانوں تم راعنا مت کہو انظرنا کہو اور سنو کافروں کے لیے دردناک عذاب

ہے۔

مقام غور ہے کہ راعنا کا لفظ تو فی الحقیقت درست ہی تھا لیکن ایک ملعون قوم نے اس لفظ سے توہین مرادی، تو رسول اللہ ﷺ کے لیے اس لفظ کے بولنے کی ممانعت آسمان سے اتری۔

پس اسی طرح بشر کا لفظ فی الحقیقت گولا کھ توہین کا کلمہ نہ ہو، لیکن ایک شقی ازلی نے جب اس کو بول کر پیغمبر کی تحقیر کی تو پھر اس لفظ کا استعمال پیغمبروں کے لیے اگر بریلوی منع کرتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں۔ یہ تو سنت الہیہ ہے کہ صحیح لفظ سے بھی اگر کوئی توہین کا ایہام کرے تو اس لفظ کا استعمال مطلقاً منع ہو جاتا ہے۔

نیز رئیس صاحب کی یہ بھی عجیب دھاندلی ہے کہ جو چیز طبیعت کے خلاف ہو اس کو بریلویوں کے سر تھوپ دیا جائے، کیوں کہ رئیس صاحب کے نزدیک شاید مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی بریلوی ہی تھے جو اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں:

گفت ما اینک بشر ایشان بشر کہنے لگے ہم بھی بشر اور رسول بھی بشر ہیں
ما وایشان بستہ خوانیم دخور ہم دونوں ہی خوراک اور خواب کے پابند ہیں
ایں نہ دانستند کوران از غمی اور اندھوں کو یہ نہ معلوم ہو سکا،

ہست فرقے درمیاں بے منتہا کہ نبی اور امتی میں بے شمار فرق ہے

جس سے معلوم ہوا کہ مولانا روم کے نزدیک بھی رسولوں کو اپنے جیسا بشر کہنا اندھوں کا کام ہے۔ آنکھ کے اندھے نہ ہوں لیکن بقول مولانا روم دل کے اندھے ضرور ہیں۔ واضح ہو کہ مولانا روم اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمہما اللہ تعالیٰ میں صدیوں کا فاصلہ ہے، پھر بھی رئیس صاحب کو یہی نظر آتا ہے کہ پیغمبروں پر بشر کے اطلاق کو برا سمجھنا بریلویوں کا عقیدہ ہے۔

علم الکتابتہ:

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی

کتاب ”الافاضات المملکیہ“ میں فرماتے ہیں:

ہندوستانی وہابیہ کے شبہات میں سے ایک شبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں فرمایا: جو لوگ نبی امی کی اتباع کرتے ہیں اور امی اس کو کہتے ہیں جو کتابت، اور نقوش اور خطوط و حساب کو نہ جانے۔

چنانچہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ تمہارے نبی امی ہیں جو نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے، اور کتابت بے شک علم شہادۃ سے ہے۔ اور اس کی انواع و اقسام بھی بے شمار ہیں، تو رسول اللہ ﷺ شہادت کے تمام افراد کے عالم نہ ہوئے۔

”میں جواب دوں گا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے لیے فن کتابت کے ملکہ کا دعویٰ نہیں کیا، ہم نے تو عدم علم کتابت کا دعویٰ کیا ہے۔ یعنی حضور ﷺ کو لکھنے کی شق نہیں تھی، لیکن یہ جانتے تھے کہ کس طرح لکھا جاتا ہے۔“ جیسا کہ قاضی عیاض نے شفا میں تحریر کیا، حضور لکھتے نہیں تھے مگر علم ہر چیز کا آپ کو دیا گیا تھا، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ حروف پہچانتے تھے اور تحریر کے کمال کا علم رکھتے تھے۔

اور اس مضمون پر دس حدیثیں نقل فرمائی ہیں:

(۱) ((ابن شعبان عن طریق ابن عباس أنه قال لا تمدوا بسم الله

(الشفاء: ۷۰۲/۱)

(الرحمن الرحيم))

بسم الله الرحمن الرحيم کو لٹکا کھینچ کر نہ لکھو۔

(۲) ((عن معاوية رضى الله عنه أنه كان يكتب بين يديه ﷺ فقال

له: ألق الدوات، وحرف القلم، وأتم الباء، وفرق السين، وتعود الميم، وحسن

الله، وخذ الرحمن، وجود الرحيم. أخرج الديلمي في مسند الفردوس))

(الشفاء: ۷۰۲/۱)

(۳) ((عن أنس رضى الله عنه عن النبي ﷺ: إذا كتب أحدكم بسم

(كنز العمال: ۲۹۲۸۵)

الله الرحمن الرحيم فليمد الرحمن))

(۴) ((عن زيد بن ثابت عن النبي ﷺ: إذا كتبت فيبين السين في بسم

الله الرحمن الرحيم))۔ الديلمي في مسند الفردوس (كنز العمال: ۲۹۲۸۶)

یہ چاروں حدیثیں بسم اللہ الرحمن الرحیم سے متعلق ہیں۔

(۵) ((عن سهل ابن الحنظلة رضى الله عنهما أن النبي ﷺ أمر معاوية أن يكتب للأقرع وعيينه، فقال عيينه: أتراني أذهب بصحيفة المتلمس فأخذ رسول الله ﷺ الصحيفة فنظر فيها فقال: قد كتب لك بما أمر)).

(ابن ابی شیبہ) (فتح الباری: ۵۰۴/۷)

حضور ﷺ نے اقرع اور عیینہ کے لیے حضرت امیر معاویہ کو ایک تحریر لکھنے کا حکم دیا، تحریر تیار ہوگئی تو عیینہ نے کہا میں ذرا اس کو رسول اللہ ﷺ کو دکھا لوں، آپ نے وہ تحریر ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا: جس جس امر کے بارے میں ان سے کہا گیا تھا لکھ دیا۔

(۶) ((عن أنس ابن مالک رضى الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: رأيت ليلة أسرى بي على باب الجنة مكتوباً الصدقة بعشر أمثالها، والقرض بثمانية عشر)) (ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم وابن مردویہ)

(کنز العمال: ۱۵۳۷)

حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے معراج کی رات جنت کے دروازے پر یہ لکھا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گنا اور قرض کا اٹھارہ۔

(۷) ”عن أبي الحمراء رضى الله عنها قال: قال رسول الله ﷺ: لما أسرى بي إلى السماء السابعة فإذا على ساق العرش الأيمن لا إله إلا الله محمد رسول الله. [طبرانی، ابن قانع، ابن مردویہ]

(کنز العمال: ۳۳۰۳۸/۱۱)

عرش کے دائیں ساق پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا دیکھا۔
بقیہ تین حدیثیں بھی ساق عرش پر کلمہ اور اصحاب اربعہ کے اسماء کی تحریر سے متعلق ہیں،
اور قاضی ابوالولید باجی کا قول بھی نقل کیا کہ آپ کو بطور مجزہ کتابت آتی تھی، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنا اسم گرامی اپنے دست گرامی سے تحریر کر دیا۔
اس اقتباس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(۱) حدیث صلح حدیبیہ مدعیان حاضر و ناظر نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بطور دلیل نہیں پیش کی ہے، بلکہ یہ ان لوگوں کے جواب میں بطور معارضہ پیش کی گئی ہے جو یہ کہتے تھے کہ

آپ امی ہیں، لہذا لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔

(۲) حضور ﷺ کتابت سے آگاہ ہونے (ملکہ نہیں) پر صرف یہی ایک حدیث نہیں خود مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دس حدیثیں نقل کیں۔

اس تفصیل کے بعد اب رئیس صاحب کی چابک دستیوں ملاحظہ ہوں: آیت مبارکہ: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنَ الْكِتَابِ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِهِ﴾ (نزول قرآن سے قبل آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے) نقل کر کے لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نبوت سے پہلے جو شخص آپ کو فن قرأت و کتابت کا عالم بتاتے ہیں وہ قرآن کا منکر ہے۔

[ابطال، ص: ۶۲]

”انوکھے دلائل“ کے عنوان کے تحت ہم بتا آئے ہیں کہ نہ کوئی اس کا مدعی ہے نہ کسی نے دعویٰ کیا، رئیس صاحب نے خود ہی بریلویوں کا یہ موقف تیار کیا اور خود ہی اس پر چاند ماری شروع کی اور بقول شاعرین:

خود کوزہ خود کوزہ گرد خود کل کوزہ خود بر سر آں کوزہ خریدار برآمد

آگے ازالہ وہم کا عنوان قائم کر کے فرماتے ہیں:

”بعض بریلوی کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک لفظ لکھ دیا تھا، اس لیے ثابت ہوا کہ آپ نبوت پانے سے پہلے بھی کاتب اور قاری تھے، یہ عجیب طرز استدلال ہے کہ نبوت کے اٹھارہویں انیسویں سال ایک حرف لکھنے کا ثبوت ہے، اور اس سے استدلال ہے کہ آدم و حوا کے وجود سے پہلے آپ حاضر و ناظر تھے۔“

[ابطال، ص: ۶۲]

کس نے استدلال کیا؟ کب استدلال کیا؟ یا آپ کے کان آپ ہی بچنے لگے، بندہ خدا حدیث استدلال میں پیش ہی نہیں کی گئی ہے، یہ تو ایک شبہ کا جواب ہے جو آپ کے بزرگوں کو لاحق ہوا تھا۔ شبہ یہ تھا کہ آپ امی تھے، لہذا لکھنے کا آپ کو علم نہ تھا، جواب ہے کہ لکھتے تو آپ بے شک نہ تھے لیکن علم آپ کو ضرور تھا، بلکہ باجی کہتے ہیں کہ بطور معجزہ آپ لکھتے بھی تھے، مگر آپ پر بریلویت کے تصور سے ہی ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ آپ از خود رفته ہو جاتے ہیں، ہمیں نہایت افسوس ہے کہ رئیس صاحب نے مصنف بن کر قرطاس قلم کی مٹی پلید کی ہے۔ آپ فرماتے

ہیں:

پھر زمانہ رسالت میں ایک لفظ لکھ دینے کے قائل صرف باجی نامی ایک صاحب علم ہیں، جو اسے ایک معجزہ قرار دیتے ہیں۔ [ابطال، ص: ۶۳]

اب ہم سے آپ رئیس صاحب کی اس بانگ بے ہنگام کی حقیقت سنئے:

ابو الولید باجی ساتھ ان کے دو استاد ابو ذر ہروی مالکی اور فقیہ ابو جعفر سمنانی حنفی بھی ہیں، محدث ابو فتح نیشاپوری اور پانچویں صدی ہجری کے افریقہ اور ثقلیہ کے دوسرے علماء بھی ہیں۔ یہی ابن جوزی حنبلی اور امام قرطبی مالکی کا مسلک ہے۔ اور ملا علی قاری مکی، امام طیبی شیخ محقق کار جہان اسی طرف ہے۔ امام نووی نے اسی کو ثابت رکھا۔ اور قاضی عیاض نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اور امام بخاری کے ہم عصر ابن شیبہ کا یہی قول ہے۔ دو تابعی امام یونس، ابن میسرہ اور عون ابن عبد اللہ اور عامر شعبی کا یہی قول ہے۔ مگر ہمارے رئیس صاحب کی بینائی کی داد دیجیے کہ انہیں صرف ابو الولید باجی نظر آ رہے ہیں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم) آپ کو حیرت ہوگی کہ رئیس صاحب کو اپنا کہا بھی یا نہیں رہتا۔ یہاں تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ صرف باجی کا قول ہے اور پانچ سطر بعد کہتے ہیں کہ فقہانے باجی اور ان کے ہم خیالوں پر شدید نکیر کی، یہ پانچ سطر بعد قاضی باجی کے، ہم خیال کہاں سے نکل آئے۔ سچ ہے دروغ گور حافظہ نہ باشد۔

پھر آپ نے باجی کا جو قول بتایا وہ بھی تحقیق کے خلاف ہے، اعلیٰ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

”ان القائلین بصدور الكتابة عنه صلی اللہ علیہ وسلم اذ ذاک تفرقوا فیہا بینہم علی أربعة أقوال: أحدها قول الباجي أنه صلی اللہ علیہ وسلم صار يحسن الكتابة کلہا بإقدار ربہ من دون أن تعلم من أحد. ثانیہا کان يحسن وضع الاسم ککثیر من الملوک، ثالثہا إنما أحسن رسم الاسم في هذا الوقت خاصة. رابعہا بل أجرى الله تعالى أدامہا الشریفة حتی صورت الاسم من دون قصد منه صلی اللہ علیہ وسلم.“

[الدولة المکیہ، ص: ۱۳۸]

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بنفس نفیس تحریر اسم کے قائل علماء کے چار قول ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرح کی کتابت پر بطور معجزہ قدرت رکھتے، یہ باجی کا قول ہے۔

(۲) بہت سے بادشاہوں کی طرح صرف اپنا دستخط کر پاتے تھے، اس قائل کا پتہ نہیں

چلا۔

(۳) صرف اسی موقع پر آپ کو اس کی قدرت ہوئی، یہ عمران ابن شیبہ کا قول ہے۔

(۴) بے قصد و ارادہ اللہ پاک نے حضور سے اسم پاک لکھوا دیا۔ یہ سمنانی اور جوزی کا

قول ہے۔

غالب نے کسی ایسے ہی جنگ جو کے بارے میں کہا تھا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اسد لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

كنت نبياً و آدم بين الماء والطين:

اگر غور سے دیکھا جائے تو کتاب ابطل کا بیشتر حصہ رئیس صاحب کی اس بد خوابی کی صداے بازگشت ہے، کہ بریلوی رسول اللہ ﷺ کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی ”حاضر و ناظر“ مانتے ہیں، اور جہاں کہیں کچھ اور بد خیالیاں بھی شامل ہو گئی ہیں، منظر اور ہیبت ناک ہو گیا ہے۔ اس قسم کا ایک مقام ابطل ص: ۲۵ پر بھی ہے:

(۱) بریلویوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ پیدائش آدم علیہ السلام سے پہلے سے ہی حاضر و ناظر ہیں۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کا خواب و خیال ہے کہ ہم حضور ﷺ کے پیدائش آدم سے بھی قبل بالفصل ”حاضر و ناظر“ ہونے کے قائل ہیں، ہم بار بار اس خیال سے برأت ظاہر کر آئے ہیں، نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے، نہ ہمارے کسی عالم کا یہ قول ہے، اس لیے آپ اپنے خواب پریشاں سے جتنی جلد ممکن ہو نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اور یہ بھی آپ کا خیال ہے کہ ہم نے اس حدیث کو حاضر و ناظر ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، قصہ اصل یہ ہے کہ مولوی عبدالرؤف صاحب جھنڈے نگر نے حضور ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کو خلاف عقل قرار دیتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ ہر مردے کی قبر میں حاضر ہوں تو لازم آئے گا، کہ آپ ہر دم دورے میں رہیں کہ ساری دنیا میں مردے ہر دم دفن ہوتے رہتے ہیں، اور یہ دنیا کے کسی حاکم کے لیے عملاً ناممکن ہے، اور لازم آئے گا کہ آپ اپنی

حیات مبارکہ میں قبر کے باہر بھی رہیں اور ہر قبر میں حاضر ہونے کی وجہ سے زندہ درگور بھی ہوں۔ ہم نے اس کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ یہ احتمالہ آپ کو اس لیے نظر آیا کہ آپ نے پیغمبر خدا ﷺ کو بھی عام انسانوں پر قیاس کیا، حالاں کہ واقعہ ایسا نہیں ہے وہ اپنے ہر وصف میں بے مثال ہیں۔ دنیا میں آنے سے قبل ہی وہ درجہ نبوت پر فائز تھے، اور دنیا میں آکر بھی بے مثال کہ جسم بے سایہ اور پسینہ مشک سے بہتر، اور عام برزخ میں بھی بے مثال کہ حقیقی زندگی کے ساتھ قبر انور میں موجود ہیں، تو دراصل حدیث ((کنت نبیاً)) مولوی عبدالرؤف صاحب کے ایک شبہ کا جواب تھی، نہ کہ مسئلہ حاضر و ناظر کے اثبات کی دلیل۔ اور اس سے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس حدیث کو ہم نے ”حاضر و ناظر“ کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے، آپ کی خام خیالی ہی ہے، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بدخواہی اور بدخیالی دونوں ہی آزار سے صحت کلی عطا فرمائے۔

(۲) دوسرا الزام یہ ہے کہ حدیث مبارکہ ”کنت نبیاً“ کے معنی تو یہ ہیں کہ میں علم الہی میں نبی تھا، یعنی خدا کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بھی یہ معلوم تھا کہ دنیا میں چالیس سال کا ہونے کے بعد مجھے نبوت ملے گی۔ لیکن بریلویوں نے حدیث میں یہ تحریف کی کہ اسی وقت سے درجہ نبوت پر فائز تھے اور آپ کو اسی وقت یہ منصب عطا کر دیا گیا تھا۔

دوسرے الزام کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا دوسرا مطلب جس کو آپ بقلم خود تحریف قرار دے رہے ہیں اور بریلویوں کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ یہ بریلویوں کا بیان کردہ نہیں، بریلی اور وہابی اختلاف سے کئی صدی قبل تمام مسلمانوں کے ایک مسلم امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ”شفاء السقام“ میں تحریر کیا ہے، یہ آپ کا کا بوس ہے کہ ہر مخالف آپ کو بریلوی دکھتا ہے، اور اپنے خلاف ہر بات آپ کو تحریف نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بیماری سے بھی آپ کو نجات دے۔

رئیس صاحب نے اس دوسرے مطلب کو غلط ثابت کرنے کے لیے بھی کچھ ہاتھ پاؤں چلائے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑے طنطنے سے کہا ہے:

(۱) اس حدیث میں ”متی وجبت لک النبوة یا رسول اللہ!“ یا رسول اللہ آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی، کا مطلب ثابت ہوئی نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت کے بارے میں لوح محفوظ میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ دوسری حدیث تحریر ہے:

((إني عند الله مكتوب خاتم النبیین و آدم لمنجدل في طينه))
 میں خدا کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور آدم علیہ السلام کا خمیر گوندھا جا رہا تھا،
 پس اسی طرح حدیث ”وجبت لك النبوة“ میں بھی وجبت کے معنی کتبت کے
 ہیں اور بات صرف تحریر کی ہے۔ درجہ نبوت ملنے کا کوئی سوال نہیں۔

(۲) خود لفظ ((وجبت)) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسی وقت درجہ رسالت پر فائز
 ہو جائیں، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی: ((وجبت لكم الجنة))
 تو جس طرح اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ اسی وقت جنت میں جا کر رہنے لگے، اسی طرح
 ((وجبت النبوة)) کا مطلب نبی ہو جانا نہیں ہے۔

ان دونوں باتوں کے جواب میں ہماری گزارش ہے کہ آپ کی پہلی تاویل کے خلاف
 خود ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری حدیث کے لفظ کتبت کو پہلی حدیث کے لفظ وجبت
 کے معنی میں مانا ہے، اور ان کی تشریح سے امام تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تائید ہوتی ہے۔ حوالہ
 ملا حظہ ہو:

((عن أبي هريرة: متى وجبت أي: ثبت لك النبوة! قال: آدم بين
 الروح والجسد، أي: وجبت لي النبوة والحال أن آدم بين الروح والجسد،
 أنه مطروح على الأرض في صورة بلا روح.

وعن عرياض ابن سارية عن رسول الله ﷺ أنه قال: إني عبد الله
 مكتوب خاتم النبیین، أي مكتوب من هذه الحیثیۃ وأن آدم لمنجدل، أي:
 ساقط في طينه، أي: كنت خاتم النبیین في حالة التي آدم مطروح على
 الأرض)) (مرقاۃ المفاتیح: ۵/۳۶۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اے اللہ کے نبی آپ کے لیے نبوت
 کب واجب ہوئی (یعنی ثابت ہوئی) آپ نے فرمایا: جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے
 درمیان تھے، یعنی اس حالت میں میرے لیے نبوت ثابت ہوئی جب آدم علیہ السلام زمین پر پتلے
 کی صورت میں بے روح کے پڑے تھے۔ اور عریاض ابن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت
 ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے وہاں اس وقت خاتم النبیین لکھا ہوا تھا (یعنی میرا

نام بحیثیت خاتم النبیین تحریر تھا) جب کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اپنی مٹی میں پڑے ہوئے تھے (یعنی اسی حالت میں خاتم النبیین تھا)۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس عبارت میں اس امر کی تصریح ہے کہ لفظ وجبت کا ترجمہ ثابت ہے، اسی میں ہے: آپ کا نام بحیثیت خاتم النبیین تحریر تھا۔ آخر میں نص فرمادی کنت نبیاً میں اسی وقت نبی تھا، پھر رئیس صاحب کا اس مطلب کو غلط قرار دینا خام خیالی کے علاوہ اور کیا ہے؟۔

اسی طرح لفظ ”وجبت لکم الجنة“ کا مطلب بے شک یہ نہیں ہے کہ اسی وقت جنت میں سکونت اختیار کریں، لیکن یہ معنی تو ضرور ہیں کہ اسی وقت سے اس آدمی پر جنتی ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ اس کا رتبہ ان لوگوں سے بڑا ہوگا جن کے بارے میں جنتی ہونے کی تصریح نہیں۔ پس اسی طرح وجبت النبوة کے بھی یہ معنی نہیں۔ کہ آپ اسی وقت سے تبلیغ کرنے لگیں اور روحوں کو کلمہ پڑھانے لگیں، بلکہ یہ معنی ہے کہ آپ کو ﷺ یہ رتبہ مل گیا، آپ کی ذات پر نبوت کا اطلاق ہونے لگا، اور ان کو اس عالم میں بھی وہ اعزاز عطا ہوئے جو انبیاء کے شایان شان ہیں۔

اس کو یوں سمجھیے کہ جس شخص نے آئی سی آلیس کا امتحان پاس کر لیا ہو کلکٹر ہو گیا، یہ درجہ اور رتبہ اسے مل گیا، رہ گئی اس کی پوسٹنگ اور تقرری اس میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ پس اسی طرح اس حدیث مبارک کا مطلب بھی ہے، کہ فائز درجہ نبوت پر تو آپ اسی وقت ہو گئے، لیکن اس کا ظہور اس عالم میں چالیس سال کی عمر میں ہوا۔

مسئلہ رویت باری تعالیٰ:

مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے یا نہیں، اور ممکن ہے تو اس عالم میں یا عالم آخرت میں، معتزلہ (کلمہ گو یوں میں ایک گمراہ فرقہ) اس بات کا قائل ہے کہ رویت باری تعالیٰ مطلقاً ناممکن ہے، نہ اس جہاں میں کوئی خدا کو دیکھ سکتا ہے نہ عالم آخرت میں کوئی اس کو دیکھے گا۔ ان کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾

[الأنعام: س ۶، ت ۱۳۰] ﴿

آنکھیں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کر سکتیں اور وہ آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے، وہ لطیف ہے

اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس کے برخلاف جمہور اہل اسلام کا کہنا یہ ہے کہ دیدار الہی اس عالم میں ممکن اور عالم آخرت میں واقع ہے۔ خود قرآن عظیم میں ہے:

﴿وَجُودَ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ . إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾

[القیامۃ: س ۷۵، ت ۲۲]۔

کچھ چہرے قیامت میں تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھیں گے۔

اور آیت اولیٰ میں رویت کی نفی نہیں ہے اور احاطہ کی نفی ہے۔

ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں عرض کی: ﴿رب ارنی انظر الیک﴾ یا اللہ تو مجھے اپنا جمال دکھا میں تجھے دیکھوں گا، اگر رویت کا امکان ہی نہ ہو جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے تو یہ سوال عبث ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کی معرفت نہ ہوگی۔ جو شان رسالت کے خلاف ہے۔

ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ آخرت میں دیدار الہی کا ثبوت یہ حدیث مشہور ہے:

((انکم سترون ربکم کما ترون القمر لیلة البدر۔))

(مسند احمد: ۳/۳۶۰)

تم آخرت میں اپنے رب کو اسی آسانی سے دیکھو گے جیسے چودھویں رات کے چاند کو آسانی سے دیکھتے ہو۔

المختصر جمہور اہل اسلام کے اس بات پر اجماع کے بعد کہ رویت باری فی نفسہ ممکن ہے اور عالم آخرت میں جملہ مومنین کے لیے واقع ہے، اس بات پر اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عالم دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا یا نہیں؟ اکثر اہل علم وقوع رویت کے قائل ہیں لیکن ایک گروہ منکر بھی ہے، جس کی سرخیل ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں، اور اپنی عادت کریمہ کے موافق انہوں نے اس امر کو بڑے زوردار الفاظ میں بیان بھی کیا ہے۔ جیسا کہ رئیس احمد صاحب نے ابطال ص: ۸۸ پر نقل فرمایا ہے۔

لیکن ہم کو رئیس صاحب کی اس خیانت علمی پر سخت افسوس ہے کہ انہوں نے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کے دلائل اس اطمینان سے نقل کیے کہ گویا اس مسئلہ میں کوئی اور رخ ہے ہی

نہیں۔

حالاں کہ جہاں انہوں نے ام المؤمنین کی حدیث ذکر کی وہیں ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، انس ابن مالک اور امام حسن کا یہ اثر بھی مذکور تھا: ”رأى محمد ﷺ ربه.“ حضور ﷺ نے شب معراج اپنے رب کو دیکھا۔

جہاں انہوں نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا: نور افسی السماء، وہیں انہیں آپ کا دوسرا قول بھی نقل کرنا چاہیے ”رأيت نوراً“ میں نے نور دیکھا، یہ روایت بھی مسلم میں پہلی روایت کے متصل ہی ہے۔

مولوی صاحب مذکور نہایت خموشی سے امام نووی کا یہ الحاصل بھی ہضم کر گئے حالاں کہ یہ بیان کے قابل تھا، امام نووی بحث کا خلاصہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”فالحاصل أن الراجح عند أكثر العلماء أن رسول الله ﷺ رأى ربه بعيني رأسه لحديث ابن عباس وغيرهما مما تقدم، وإثبات هذا لا يأخذونه إلا بسماع عن رسول الله ﷺ.“ [مسلم جلد اول ص: ۹۷]

خلاصہ یہ ہے کہ اکثر علما کے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا، کیونکہ ابن عباس وغیرہ اجلہ صحابہ اس بات کو رسول اللہ ﷺ سے سنے بغیر نہیں کہہ سکتے۔

اب اس امر کا فیصلہ ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں، کہ رئیس صاحب نے اکثر اہل علم کے قول پر پردہ ڈال کر کتنی حقیقتوں کا خون کیا ہے؟ اور اس حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد رئیس صاحب کے وہم بالفرض کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

بوقت صبح شوذ ہجور روز معلومت کہ بہ کے باختہ عشق در شب دیہور

عالم برزخ، اور حیات برزخی:

مولوی عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ”خیر الانبیاء“ میں حاضر و ناظر کے معنی بیان کرتے ہوئے اس امکان کا بھی ذکر کیا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جسم اقدس کے ساتھ عالم میں سیر کر سکتے ہیں۔

اس بات کو رد کرنے کے لیے رئیس احمد صاحب نے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ”عالم

برزخ سے کوئی دنیا میں واپس نہیں آئے گا۔ [ابطال، ص: ۱۰۲]

اور دلیل میں قرآن عظیم کی وہ آیتیں اور حدیثیں پیش کیں جن میں تشریح ہے کہ اہل جہنم خداے تعالیٰ سے درخواست کریں گے، کہ تو ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دے، تاکہ ہم اعمال صالحہ کریں۔ حکم ہوگا اب دوبارہ لوٹنا نہیں۔ یا شہدا تمنا کریں گے یا الہی ہم کو دنیا میں پھر بھیج دے کہ تیری راہ میں دوبارہ شہید ہوں، حکم ہوگا اب تمہاری واپسی دنیا میں نہ ہوگی۔

رئیس صاحب کی اس تقریر کا اگر صرف یہ مطلب ہو کہ عادت الہیہ یہی ہے کہ عام مردے عالم برزخ سے وارد دنیا میں واپس نہیں ہوتے اور اسلام ہندومت کے آواگون کا قائل نہیں ہے تو صحیح ہے، لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہو کہ اس عام عادت الہیہ کے برعکس بطور خرق عادت بھی کسی جانے والے کی وارد دنیا میں واپسی ناممکن ہے، اور ایسی واپسی قدرت الہی سے باہر ہے تو یہ جھوٹ اور تصریحات قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

قرآن عظیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿وَأُبْرِءُ الْأَكْمَةَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾

[ال عمران: ص ۳، ت ۴۹]

میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص والے کو اچھا کرتا ہوں، اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔

رئیس صاحب بتائیں کہ اعجازِ سبحانی سے زندہ ہونے والے عالم برزخ سے پلٹ کر دنیا میں آئے یا نہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

[البقرة: ص ۲، ت ۵۵]

اے یہودیو! تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم تو خدا کو دیکھے بغیر ایمان نہ لائیں گے، تو تم کو ایک کڑک نے پکڑ لیا اور تم دیکھتے ہی رہ گئے، پھر تم کو تمہاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا کہ تم اپنے خدا کا شکر ادا کرو۔

رئیس صاحب بتائیں! کیا یہ سرمہ بصیرت بھی ان کی بے نور نگاہوں کے لیے کافی نہیں، ستر آدمی دیکھتے ہی دیکھتے مر گئے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا، قدرت خداوندی سے دوبارہ جی آٹھے، کیا یہ بھی برزخ سے وارد دنیا میں واپسی نہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا ذکر قرآن عظیم میں ان الفاظ میں ہے:

﴿فَأَمَّا تِلْكَ الْمِثَّةَ غَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ

[البقرة: س ۲. ت ۲۵۹]

قَالَ بَلْ لَبِثْتُ مِثَّةَ غَامٍ﴾

اللہ تعالیٰ نے سو سال تک کے لیے حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم سے روح نکال لی پھر انہیں زندہ اٹھا کر پوچھا، کتنے دن یہاں ٹھہرے رہے، آپ نے عرض کی ایک دن یا اس سے کچھ کم، حکم ہوا سو سال تک آپ اسی عالم میں رہے۔

رئیس صاحب غور فرمائیں یہ سو سال کی موت کے بعد دوبارہ زندگی کا کارواں رواں دواں ہو جاتا۔ عالم برزخ سے واپسی نہیں تو کیا ہے۔

احادیث معراج میں تصریح ہے:

”وقد رأيتني في جماعة من الأنبياء، فإذا موسى قائم يصلي، وإذا عيسى قائم يصلي، وإذا إبراهيم قائم يصلي، فحانت الصلاة فأممتهم.“

(الشفاء: ۳۵۰/۱)

میں نے شب معراج خود کو انبیاء کی جماعت میں پایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، پھر نماز کا ٹائم ہوا تو میں نے ان سب پیغمبروں کی امامت کی۔

بولیے گزشتہ انبیائے کرام کا عالم برزخ سے اپنے اپنے مقامات کو چھوڑ آنا، اور بیت المقدس میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھنا کس درجہ طویل مسافت کی سیر ہے، تو رئیس صاحب اس کو کیا کہیں گے؟۔

پس اسی طرح اگر حضور ﷺ بھی اپنے جسدِ عَصْرٰی کے ساتھ عالم برزخ سے اس عالم میں تشریف لائیں تو کیا شرعی قباحت لازم آئے گی؟ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ رئیس صاحب کو ہر موقف میں صرف یک طرفہ نصوص نظر آتے ہیں، قرآن عظیم میں ایسے ہی موقعہ پر ارشاد ہوا:

﴿أَفْتَوْ مُنُونٌ بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بَعْضُ﴾

[البقرة: س ۲ ت ۵۵] ﴿

کیا بعض کتاب اللہ پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کرتے ہو۔

(۲) مسئلہ حیات النبی ﷺ میں مولوی عبدالرؤف صاحب کے یہاں بیان میں تضاد تھا، اپنی کتاب ”تردید حاضر و ناظر“ میں کہیں انہوں نے یہ لکھا تھا، کہ شہدا کے لیے قرآن عظیم میں بل اُحیاء آیا ہے، اس لیے وہ قبروں میں زندہ ہیں اور رسول اللہ کے لیے انک میت آیا ہے اس لیے وہ مردہ ہیں، کہیں یہ لکھا تھا کہ انبیاء اپنی قبر میں زندہ نہیں رہتے اور اس کو حدیث شریف کا مضمون بتایا تھا، کہیں یہ لکھا تھا کہ حیات انبیاء کے مسئلہ میں کوئی جان نظر نہیں آئی۔ اور ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ اپنی قبر میں ابدی راحت اور سرمدی آرام کے ساتھ ہیں۔

الشہادہ ص: ۲۳ تا ۲۷ میں ہم نے اسی تضاد کو اجاگر کیا تھا، اور انبیاء کی موت کے سلسلہ میں ان کے نظریہ کی تنقید کی تھی۔ مولوی رئیس صاحب نے اس کو ہماری زیادتی قرار دیا ہے، کہ ہم نے فاضل رحمانی اور دیگر علمائے وہابیہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے قبر میں زندہ رہنے کے قائل نہیں ہیں، پھر سب کی طرف سے حیات برزخی کے سلسلہ میں یہ عقیدہ ظاہر کیا ہے: ”ہم بالفرض تمام انبیاء بلکہ مومنین و شہدا کی حیات برزخی کے قائل ہیں اور پورا عقیدہ رکھتے ہیں کہ مرنے والا اپنے اپنے مرتبہ اور اعمال کے اعتبار سے عالم برزخ میں زندگی گزار رہا ہے۔ اور یہ کہ انبیاء و مرسلین اور شہدا کی لاش کو مٹی نہیں کھائی، ہاں یہ عقیدہ کہ دنیاوی اعتبار سے انبیاء کو مردہ نہ سمجھنا چاہیے تو اس کے باطل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہ صرف بریلویوں کا اختراعی اور نواہیجا عقیدہ ہے۔ [ابطال، ص: ۹۶]

اس کے بعد جو رگ وہابیت اچھل تو اسی قسم کی آیتوں کی تلاوت شروع کر دی جس میں انبیائے کرام علیہم السلام پر موت طاری ہونے کا بیان ہے، اور اسی تضاد کا اظہار کیا جس کا شکار مولوی عبدالرؤف صاحب ہوئے ہیں۔

مولوی رئیس صاحب نے جہاں تک ہمارے الزام لگانے کی بات کہی ہے، اس کی صحت و قسم کا اندازہ ہماری کتاب کے مذکورہ بالا صفحات کا مطالعہ کر کے لگایا جاسکتا ہے، اور مولوی رئیس صاحب کے غلط بیانی کی داد دی جاسکتی ہے، ہمیں حیرت ہے کہ یہ شخص تصنیفی دیانت اور علمی

امانت کے خون پر کس درجہ جری ہے، اور خلاف واقعہ الزام تراشی کرتے ہوئے اس کو ذرا بھی خدا کا خوف نہیں ہوتا۔

بتو بتاؤ خدا کو جواب کیا دو گے خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بند ہائے خدا مگر ہم بحث کو مختصر کرنے کے لیے رئیس صاحب کی تمام چالوں سے قطع نظر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حضرات بقول رئیس احمد صاحب انبیائے کرام کی برزخی زندگی کے قائل ہیں، لیکن اس دنیاوی زندگی جیسا نہیں سمجھتے، اور یہی علمائے اہل سنت و وہابیہ کا بابہ الاختلاف ہے، پھر بھی رئیس صاحب اتنا کہہ دینے سے عہدہ برآ نہ ہوں گے، نہ اس کو بریلویوں کا نو ایجاد عقیدہ کہہ دینے سے نجات ملے گی، کیوں کہ مولوی عتیق الرحمن صاحب مغفور کا ایک قرض فاضل رحمانی اور ان کے وکیل مولوی رئیس صاحب پر سوار ہے، جس کو نہ انہوں نے چکایا نہ مولوی رئیس صاحب نے ہاتھ لگانے کی ہمت کی۔

مولانا عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے قبر انور میں دنیاوی زندگی کے ساتھ زندہ رہنے پر شیخ محقق علی الاطلاق مولانا عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حوالہ سے تمام علماء اسلام کا اجماع نقل کیا تھا، اپنی کتاب الشاہد میں میں نے بھی اس موضوع پر فاضل رحمانی کو جھنجھوڑا تھا، لیکن جواب دیتے وقت وہ تو خیر کیا بولتے مولوی رئیس احمد صاحب بھی زھول میں مبتلا ہو گئے، اس لیے رئیس صاحب کو اس اجماع کا جواب تو دینا ہی پڑے گا، اور یہ بھی بتانا ہو گا کہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی روایت کے مطابق سارے علمائے اسلام کب سے بریلوی ہو گئے؟ کیوں کہ آپ کی تحقیق میں تو یہ عقیدہ بریلویوں کا تھا۔

مولانا رئیس صاحب آپ نے یہ حدیث توسنی ہوگی: ”کفی بالمرء کذباً أن يحدث بكل ما سمع.“ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کر دے، تو جب سنی سنائی کا یہ حکم ہے تو آپ کے اس تراشیدہ صاف نمودہ درافواہ رسیدہ کا کیا حکم ہوگا؟۔

قبر میں تشریف آوری:

بخاری شریف میں ایک حدیث ہے:

((إن العبد إذا وضع في قبره وتولى عنه أصحابه وأنه يسمع قرع نعالهم أتاه ملكان، فيقعدانه، فيقولان: ما كنت تقول في هذا الرجل (لمحمد)؟ فيقول: أشهد أنه عبده ورسوله، فيقال له: أنظر مقعدك من النار، قد أبدلك الله لك مقعداً من الجنة، فيراهما جميعاً... وفي ذكر الكافر: ويضرب بمطارق من حديد فيصيح يسمعها من يليه غير الثقلين.))

[مشکوٰۃ باب اثبات عذاب القبر]

بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی دفن کر کے واپس ہوتے ہیں اور وہ جانے والوں کے قدموں کی آواز سنتا ہے اسی وقت دو فرشتے آتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ تو اس آدمی (رسول اللہ) کے بارے میں کیا کہتا ہے، وہ کہے گا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، تو اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اپنا جہنم والا ٹھکانا دیکھ اس کے بجائے اللہ نے تجھے جنت میں ٹھکانا بخشا، تو وہ جنت اور دوزخ دونوں کو دیکھتا ہے..... اور کافر کے بیان میں یہ ہے کہ فرشتے اس کو لوہے کے گرز سے ماریں گے جس کے چیخ کی آواز آدمی اور جن کے علاوہ اس پاس کی ساری مخلوق سنتی ہے۔

(۱) اس حدیث میں ہے کہ قبر میں مردہ زندہ ہوتا ہے، اور دو فرشتے آتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس گڈے میں سانس لینا ممکن نہیں، مردے کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں، مردہ زندہ کیسے ہوتا ہے اور مردہ کے علاوہ دو دوزخ و سماوات کیسے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ساری واردات مردے پر خواب و خیال میں گذرتی ہیں؟

بہر حال اسلام کا جواب ہوگا خاموشی کہ قبر میں جو کچھ کرتا ہے یہ خواب و خیال نہیں، ایک حقیقت نفس الامر کی ہے، کیا ہم نے حدیث نہیں سنی، اللہ تعالیٰ نے روک دیا ورنہ جن و انس مردوں کی پکار سنتے رہ گئے تمہارے سوالات اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عالم برزخ کا معاملہ ہے، اس کو دنیا پر قیاس نہ کرو، وہ یہاں سے ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا، جس طرح ماں کے پیٹ کا بچہ اس عالم دنیا کی وسعت اور حوادث کا اندازہ پیٹ میں رہ کر نہیں لگا سکتا، اسی طرح اس دار دنیا سے عالم برزخ کی حقیقتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے، یہ بات تو تب سمجھ میں آئے گی جب آدمی اس عالم میں پہنچے گا۔

(۲) اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ مردے کو اٹھا کر بٹھائیں گے۔ آپ پھر حیرت سے دریافت کریں گے اگر یہ امر واقع ہے تو قبر میں اتنی جگہ کہاں ہے اور اس کا امکان کیوں کر ہے؟ پھر وہی جواب ملے گا: خاموش عالم برزخ کا ہر امر واقعی اور حقیقی ہے، خواب و خیال کی یہاں گنجائش نہیں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عالم برزخ کی واردات کو دار دنیا پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ (۳) اسی حدیث میں ہے، مردے کو جنت اور دوزخ دونوں دکھائی جائیں گی۔

آپ حیران ہو کر سوال دہرائیں گے، جنت جس کی وسعت میں ساتوں آسمان اور زمین سما جائیں، وہ یہاں قبر میں کہاں؟ جواب ہو گا وہ واقعی جنت ہی کو دیکھے گا، تم اس کو اس دنیا میں قبر کے اندر نہ تلاش کرو، نہ قبر کے آس پاس ڈھونڈو، یہ عالم برزخ کی بات ہے جو ہماری اس دنیاوی زندگی میں ہم سے دور ہے۔

(۴) اسی حدیث میں کافر کے لیے گرز کا ذکر ہے اور اس کے چیخنے کا بیان ہے، بعض روایتوں میں مومن کے لیے ستر ستر گرز قبر کے وسیع ہونے کا بیان ہے۔ وہ بھی واقعی، حقیقی اور نفس الامری ہے۔ الغرض اس قسم کی جتنی چیزوں کا ذکر ہے سب کا تعلق واقع اور حقیقت سے ہے، خواب و خیال سے نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے پوچھیں گے کہ یہ کون ہیں؟ تو کیا اشارہ کرتے وقت حقیقۃً رسول اللہ ﷺ کی ذات مردہ کے سامنے ہوتی ہے، یا مردہ کے دماغ میں رسول اللہ ﷺ کا جو تصور اور خیال ہے اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے؟

اگر آپ اس سوال کے جواب میں یہ کہنے لگیں کہ رسول اللہ واقعہً وہاں موجود نہ ہوں گے، بلکہ مردے کے دماغ میں حضور کا جو تصور ہے اس کی طرف اشارہ ہوگا، کیوں کہ ہر مردے کی قبر میں حضور ﷺ کا تشریف لانا ایک امر محال ہے۔

تو میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ اس موقع پر کیا آپ کا جواب ایمان دارانہ ہے، برزخ میں پیش آنے والی کون سی چیز ہے جو آپ کے عقل میں آرہی ہے، مگر آپ نے سب کو واقعی اور حقیقی مانا، اور سب کو عقل کے خلاف ہوتے ہوئے برزخ کے حوالہ کیا تو صرف ذات رسول کے سلسلہ میں آپ کی یہ عقل کہاں سے کود پڑی، اور یہاں آپ عالم برزخ کو کیوں بھول گئے۔

اس لیے اس پوری حدیث کے پس منظر میں ایک فطری بات یہی ہے کہ، جب قبر کا ہر

منظر آپ نے واقعی مانا تو یہ اشارہ بھی واقعی ہوگا، اور اشارہ کے وقت ذات رسول بھی وہاں موجود ہوگی۔ نیز خیال و تصور کی طرف اشارہ تو اس شخص کے لیے ممکن ہوگا جو مسلمان ہو، اور جس کے تصور میں رسول اللہ ﷺ کا خیال رہتا ہے، لیکن ایک غیر مسلم جو پیغمبر اسلام کے بارے میں کبھی سوچتا ہی نہیں، جو مرتے وقت بھی اپنے دیوتاؤں کے تصور میں مرا، بھلا مرنے کے بعد یک بیک اس کے خیال میں رسول اللہ ﷺ کا تصور آنے کا کیا موقع ہے، کہ اشارہ خیال کی طرف مانا جائے، اور یہ سوال تو سبھی سے ہوگا، ہاں یہ عین ممکن ہے اور فطری بھی کہ جس طرح شناخت کے وقت متعلقہ شخص کو سامنے کر کے پوچھا جاتا ہے، اس کو پہچانتے ہو؟ اسی طرح حضور ﷺ کو بھی مردے کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، مومن چوں کہ زندگی بھر ان کے اوصاف سنتا رہا، ان کے خیال میں مست رہا، مرتے دم بھی ان کے تصور میں سرشار رہا کہ قبر میں زیارت ہوگی، دیکھتے ہی پکار اٹھے گا: ہو عبد اللہ ورسولہ۔

آج پھولے نہ سائیں گے کفن میں آسی گور کی رات ہے اس گل سے ملاقات کی رات
اور کافر چوں کہ زندگی بھر ان سے سروکار نہیں رکھتا تھا، اس لیے اس کو کہنا پڑے گا: ”ہاھا لا أدري“ افسوس میں نہیں جانتا۔

اور اسی بات کی تائید زبان و بیان کے اصول سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ عربی زبان میں لفظ ”ہذا“ محسوس، مبصر اور قریب کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اور یہ اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں، تو قبر میں جس ذات پاک کی طرف لفظ ”ہذا“ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، اس کو قریب بھی ہونا چاہیے، نظر بھی آنا چاہیے، اور محسوس بھی ہونا چاہیے، اور کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی سے پھر کر مجازی معنی مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ بھی ہو۔

حدیث مذکورہ بالا میں جب دیگر اشیاء کے خلاف عقل ہوتے ہوئے بھی آپ نے حقیقی معنی مراد لیا ہے، تو اس لفظ ”ہذا“ کے حقیقی معنی مراد لینے سے بھی عقل مانع نہیں ہو سکتی۔ اور حدیث میں معنی حقیقی کے خلاف مجازی معنی مراد لینے پر کوئی قرینہ بھی نہیں ہے، انہیں وجوہ کی بنا پر علماء کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قبر میں حضور ﷺ بنفس نفیس موجود ہوں گے۔ اور انہیں کو دکھا کر انہیں کی طرف اشارہ کر کے منکر نکیر کہیں گے: ”ما تقول في هذا الرجل“ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ قسطانی میں ہے:

”والبقائل به إنما استند لمجرد أن الإشارة لا تكون إلا للحاضر، ولكن يحتمل أن يكون الإشارة لما في الذهن فتكون مجازاً.“

[حاشیہ مشکوٰۃ، ص: ۲۳۰]

اور حضور کے قائل نے اس بات پر بھروسہ کیا کہ ”ہذا“ کا اشارہ محسوس، مبصر کی طرف ہی ہوتا ہے، لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اشارہ موجود فی الذہن کی طرف ہو اور معنی مجازی مراد ہوں۔ ہم یہاں نہایت ادب سے امام قسطلانی سے عرض کریں گے، حضور آپ کی امامت و سیادت برحق، اور فضل و کمال سر اور آنکھ پر لیکن لفظ ”ہذا“ کو یہاں اپنے معنی حقیقی سے پھیرنے والا کون سا قرینہ ہے۔ ارشاد فرمایا جائے گا، اگر کوئی قرینہ نہیں ہے تو معنی مجازی کا قول تحکم ہوگا، اور حقیقی حضور کا قول کرنے والے برحق ہوں گے۔

حضرت عبدالحق محدث دہلوی نے بھی یہ قول نقل کیا ہے، مگر تھوڑے تصرف کے ساتھ وہ فرماتے ہیں: ”یا باحضار ذات شریف وے در عیان بایں طریق کہ در قبر مثالی از حضرت ﷺ حاضری ساختہ باشد“۔

یا نفس الامر میں آپ کی ذات مبارکہ قبر میں حاضر کی جاتی ہے، اس طور پر کہ حضور کو آپ کے جسم مثالی کے ساتھ لایا جاتا ہو۔

حضرت شیخ کا منشا اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ لفظ ”ہذا“ کو حقیقی معنی پر ہی محمول کرتے ہیں، اسی لیے آپ کی ذات شریف کو قبر میں حاضر کرنے کی بات کرتے ہیں، تاکہ لفظ ”ہذا“ کے تینوں معانی کا تحقق ہو۔ آپ محسوس ہوں، دیکھے بھی جائیں، اور قریب بھی ہوں، لیکن یہ بات انہیں مستبعد معلوم ہوئی کہ جسد عنصری تو رسول اللہ ﷺ کا ایک ہی ہے جو اس دنیا میں رہا، اور اب مدینہ منورہ میں قبر شریف میں ہے۔ اور مردے ہر دم اور ہر جگہ ہوتے ہیں، اور بات عالم برزخ کی ہے جہاں ایک شخص کے متعدد جسم ہو سکتے ہیں، اور اس میں کوئی استبعاد نہیں، اس لیے فرمایا: حضور ہر قبر میں لائے جاتے ہیں، لیکن جسد عنصری کے ساتھ نہیں عالم برزخ کے جسم مثالی کے ساتھ۔

یہی وہ چیز ہے جس کو رئیس صاحب نے اپنی کم علمی سے فوٹو اور تصویر سمجھ رکھا ہے، اس عبارت میں مثال کا ترجمہ فوٹو اور تصویر ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ شیخ نے فرمایا: ”احضار ذات

شریف وے درعیاں“ قبر میں حضور کی ذات پاک لائی جاتی ہے، بھلا فوٹو کو بھی کوئی ذات کہتا ہے، فوٹو فوٹو ہے آدمی کی ذات نہیں ہو سکتا، مگر ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ رئیس صاحب اس قسم کے معاملات میں قابلِ عفو و درگزر ہیں، بے چارے اپنے مبلغِ علم بھر ہی تو بات کر سکتے ہیں۔
قسطلانی نے ایک قول اور نقل کیا:

”قیل یکشف للمیت حتی یری النبی ﷺ.“ [حاشیہ مشکوٰۃ: ص ۲۴]

میت اور حضور کے درمیان حجاب اٹھا دیا جاتا ہے تو میت رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہے۔
امام قسطلانی بھی اس قول کی یہی توجیہ کرتے ہیں کہ ”ہذا“ محسوس مبصر کے لیے ہے۔
اس واسطے از روئے لفظ حدیث قبر میں مردے کو رسول اللہ ﷺ کا محسوس ہونا اور نظر آنا ضروری ہے، اس توجیہ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ”ہذا“ کے مفہوم میں مشار الیہ کا قریب ہونا بھی تو ضروری ہے، اور جب حضور ﷺ اپنی قبر اطہر میں ہوتے ہیں اور مردہ اپنی قبر میں تو حجابات اٹھنے کے باوجود قرب کہاں ہوا۔ اس لیے ”ہذا“ سے اشارہ کی کیا سبیل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دور کی چیز بھی دیکھنے والے کو قریب محسوس ہوتی ہے، جیسے چاند حقیقت میں زمین سے تقریباً ڈھائی کروڑ میل دور ہے، لیکن دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ میل دو میل کی دوری پر ہوگا اور وہ کہہ اٹھتا ہے ”ہذا الہام والہ العظیم۔“ چاند یہ رہا، اسی طرح گو حقیقت میں سرور عالم ﷺ اپنی قبر میں ہوتے ہیں، لیکن دیکھنے والے کو قریب محسوس ہوتے ہیں اور فرشتے انہیں دکھا کر کہتے ہیں: ”ما تقول فی هذا الرجل“
میں یہ مانتا ہوں کہ علمائے اس احتمال کا بھی ذکر کیا ہے کہ اشارہ سید عالم ﷺ کے اس خیال کی طرف ہے جو مرنے والے کے ذہن میں ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بھی مذکورہ بالا احتمالوں کی طرح ایک احتمال ہی ہے، جیسا کہ قسطلانی نے تصریح کی ہے:

”ویحتمل أن یکون الإشارة لسا فی الذہن.“

پھر اسی کو ترجیح ہو اور اوپر والے احتمالات متروک ہوں، آخر ایسا کیوں ہوا، وجہ ترجیح کے بغیر ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

رہ گئے ہمارے رئیس صاحب ان کو تو اپنے من کی کوئی بات مل جانی چاہیے، پھر صحت

وسقم سے قطع نظر وہی بات ان کے لیے وحی الہی ہو جاتی ہے، امام قسطلانی کی ”معہود فی الذہن“ والی عبارت خود ہی نقل کرتے ہیں، اور اس بات پر ہمارا مذاق کس اڑاتے ہیں کہ ہم نے احتمالات کا سہارا لیا ہے، گویا آپ نے اشارہ والی بات جو کہی ہے وہ کوئی نص قطعی ہے، احتمال ہونے میں کبھی برابر ہیں، اس لیے اس کا طعنہ دینا بے کار ہے۔

رئیس صاحب بڑے فخر سے کہتے ہیں: امام قسطلانی نے کہا حضور اور مردے کے درمیان سے پردہ اٹھانے کا کوئی ثبوت ہی نہیں، میں کہتا ہوں، کیا کسی روایت میں ایسا ہے کہ پردہ نہیں اٹھے گا۔ بلکہ معہود فی الذہن کی طرف اشارہ ہوگا؟ نہیں ہے، تو پھر موجود ذہنی کی طرف اشارے والی بات کا بھی تو کوئی ثبوت نہیں ہوا، پھر اس پر آپ کیوں اترارہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی روایت میں منصوص طریقہ پر نہ یہ لکھا ہے کہ جسد عرضی کے ساتھ آپ قبر میں تشریف لائیں گے، نہ منصوص طور پر یہ ہے کہ وجود ذہنی کی طرف اشارہ ہی کیا جائے گا، صرف یہی ایک حدیث ہے کہ ”هذا الرجل“ کہہ کر ان کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ اور اس کے وہ چاروں معنی بیان کیے گئے ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے موافق مراد لے کر اس کی کچھ ترجیحات شمار کرائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل و نقل کی کسوٹی پر اس کو پرکھا جائے کہ دلائل کس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ لفظ کو اس کے حقیقی معنی سے پھیرنے کے لیے معنی حقیقی کا عقلاً محال ہونا اور قرینہ صارفہ کا موجود ہونا ضروری ہے، اور اس معاملہ میں معنی حقیقی کا مراد لینا تو اس لیے محال نہیں کہ اس سے بڑے بڑے محالات کو خود آپ نے اسی حدیث میں عالم برزخ کا معاملہ کہہ کر قبول کر لیا ہے۔ تو صرف ایک امر کو خلاف عقل کہہ کر کیسے رد کر سکتے ہیں۔ اور حدیث میں قرینہ صارفہ کا تو کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ معنی حقیقی مراد لیں۔

مگر رئیس الاحرار صاحب کے قربان جانیے وہ اپنے نام کی طرح بالکل بے قید و آزاد نکلے، انہوں نے ایک سند ڈھونڈ نکالی کہ بے قرینہ لفظ ”هذا“ کے مجازی معنی خود حدیث میں مراد لیے گئے ہیں، آپ تحریر کرتے ہیں:

”قصر روم نے مدینہ سے سیکڑوں میل دور پر ابوسفیان سے پوچھا: ”ما هذا الرجل

الذي بعث فيكم“ تو کیا قیصر روم نے حضور کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا؟۔

[ابطال، ص: ۱۰۰-۱۰۱]

نہیں صاحب بالکل سامنے لا کر کھڑا نہیں کیا تھا، لیکن وہ آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے کہ دور دور تک رسول اللہ ﷺ اپنے جسد غصری کے ساتھ یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر ”ہذا“ کے معنی وہ موجود شخص لیتے تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہوتی۔ اور یہی مشاہدہ کی تکذیب وہاں قرینہ بن گئی کہ ”ہذا“ کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہیں۔ پھر دوسرے قرائن بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا خط ہرقل کے پاس پہنچا تھا، اور ہرقل نے اسی کی تفتیش کے سلسلہ میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اپنے دربار میں بلایا تھا۔ پس اس ماحول میں لازماً یہ خیال آنا ضروری تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہی پوچھ گچھ ہوگی۔ ایسی حالت میں اس نے ”الرجل“ کہا تو ذہن لاجالہ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

یہاں منکر نکیر کے سوال کے وقت کس نے عالم برزخ میں جا کر مشاہدہ کیا ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ عیناً موجود نہیں کہ ”ہذا“ کے معنی مجازی مراد ہونے پر اس کو قرینہ قرار دیا جائے۔ رئیس صاحب نے احتیاطاً ایک حدیث اور ڈھونڈ نکالی جس میں ایسے الفاظ ہیں جن کو رئیس صاحب نے حقیقت کے خلاف معنی مجازی مراد لینے کا قرینہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

”امام محمد طبرانی کی روایت میں ہے کہ مردے سے جب ”ما تقول في هذا الرجل“ کہا جاتا ہے تو وہ پوچھ لیتا ہے: ”من“ تو جواب ملتا ہے کہ ”محمد“ اگر آپ موجود ہوتے تو اس سوال و جواب کی کیا ضرورت؟۔ [ابطال، ص: ۱۰۱]

مگر ہمیں افسوس ہے کہ رئیس صاحب کی یہ کوشش بھی راگلاں ہی گئی، کیوں کہ یہ سوال و جواب وہاں موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، کیوں کہ آپ کے وہاں موجود ہونے کے بعد بھی، آپ کو دیکھ کر اور محسوس کر کے بھی آدمی آپ کے بارے میں پوچھ سکتا ہے، کہ جن کو مجھے دکھا رہے ہو یہ کون ہیں، اور اس کا خود رئیس صاحب کو بھی اعتراف ہے، وہ خود لکھتے ہیں: ”پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ جس نے آپ کو (زندگی میں) نہ دیکھا ہو، وہ آپ کو پہچان ہی لے“۔

تو عین ممکن ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے لیے وہ سوال و جواب ہو، جو دیکھنے کے بعد بھی

آپ کو نہ پہچان پائیں گے، کیوں کہ عام اور صحیح ترین روایتوں میں تو اس کا کوئی ذکر نہیں، پس جب موجودگی کے بعد یہ سوال وجواب ہو سکتا ہے تو یہ سوال وجواب عدم موجودگی کا قرینہ کیسے بن سکتا ہے؟۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث مذکور میں لفظ ”هذا الرجل“ کے مندرجہ ذیل مطالب ہو سکتے ہیں:

- (۱) آپ ہر مردے کی قبر میں اپنے جسد غصری کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔
 - (۲) جسد غصری کے ساتھ تو نہیں البتہ جسم مثالی کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔
 - (۳) آپ کسی مردے کی قبر میں تشریف نہیں لاتے اپنی قبر انور میں ہی تشریف فرما ہوتے ہیں، لیکن ہر مردے کے سامنے سے حجابات اٹھا دیے جاتے ہیں اور وہ اپنی قبر سے ہی حضور ﷺ کا دیدار کر لیتا ہے۔
- یہ تینوں معانی لفظ ”هذا“ کے حقیقی معنی کے ترجمان ہیں، اور بلا قرینہ معنی حقیقی سے انحراف جائز نہیں۔

- (۴) آپ کہیں موجود نہیں ہوتے، ہر مردے کے ذہن میں رسول اللہ ﷺ کا جو خیال ہے اسی کی طرف اشارہ ہے، ان معانی کے مالہ و ماعلیہ پر بحث گزر چکی۔
- اب ذرا پلٹ کر حاضر و ناظر کے معنی پر بھی اک نگاہ ڈالی جائے، اور رئیس صاحب کے ریمارک کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔

- (۱) قوت قدسیہ والا ایک جگہ رہ کر تمام کو اپنے کف دست کی طرح دیکھے (شاہد ص: ۳۷) یہ معنی یہاں حدیث کے مذکورہ بالا معانی میں سے تیسرا معنی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں آپ ایک جگہ ہیں اور سارے عالم کو دیکھ رہے ہیں۔ اور یہاں بھی آپ ایک جگہ ہیں اور سارے عالم کے مردے آپ کو دیکھ رہے ہیں، یعنی دونوں طرف سے انکشاف ہے۔
- اس پر یہ کہنا کہ ”ایک چاند سارے عالم کے گھر میں کہاں اتر آتا ہے“ زبان و بیان اور عام محاورہ کو منہ چڑھانا ہے، کیوں کہ یہ عام محاورہ ہے کہ ”چاند ایک ہی جگہ ہے مگر جہاں جاؤ اس کو موجود پاؤں گے۔ مندرجہ ذیل شعر:

والقمر من حیث التفت رأیته یعطیک فی عینک نوراً ثاقباً

اسی حقیقت کی ترجمانی ہے اور حاضر و ناظر سے ہمارا ایک مطلب یہ بھی ہے:
 (۲) ایک آن میں تمام عالم کی سیر اس جسم کے ساتھ جو قبر میں مدفون ہے، (الشاہد، ص: ۲۷) یہ معنی ٹھیک وہی ہے جس کو یہاں معانی حدیث میں (۱) پر درج کیا گیا۔
 (۳) ایک آن میں تمام عالم کی سیر جسم مثالی کے ساتھ (الشاہد، ص: ۳۷) یہ معنی یہاں (۲) سے بیان ہوئے۔

پس ثابت ہوا کہ مولانا عتیق الرحمن صاحب کا اور دلائل کے ساتھ حدیث مذکور کو بھی اپنی تائید میں پیش کرنا ایک وجہ وجہہ رکھتا ہے اور اس کے خلاف کی خامہ فرسائی فضول گوئی میں داخل ہے۔

مرا گفت کہ اے نازنیں ز پردہ برآ
 بغمرہ بر صف مرداں شیر آنگن زن
 معجزہ وقتی یادوامی:

اس عنوان کی تقریب یہ ہے کہ مولوی عتیق الرحمن خاں صاحب مرحوم نے حضور سید عالم ﷺ کے علم عام و تام کے اثبات کے لیے دو حدیثیں پیش کی تھیں:

(۱) ”فوضع كفہ بين كفتي فوجدت برد أنامله بين ثدي فتجلى لي كل شيء وعرفت.“
 (صحیح بخاری: ۱۵۵/۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا تو میں نے وصول فیض اپنے سینے میں محسوس کیا، تو ہر چیز میرے لیے روشن ہو گئی اور پہچان لیا۔

(۲) ”لا تسألوني عن شيء إلا نبأكم وأنا في مقامي هذا.“
 (مسند امام احمد: ۵۰۳/۲)

جب میں منبر پر ہوں تم مجھ سے جو پوچھو گے بتاؤں گا۔

ان حدیثوں پر مولوی عبدالرؤف صاحب کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں ایک خاص وقت میں انکشاف اور تعلیم کا ذکر ہے، لہذا منطق کی اصطلاح میں یہ قضیہ وقتیہ ہوا۔ اور ایسے احکام اسی وقت تک محدود رہتے ہیں جس وقت کا ذکر اس جملہ میں ہو۔ اس لیے جب تک یہ انکشاف رہا مثلاً پہلی حدیث میں خواب کے اندر اور دوسری حدیث میں قیام منبر تک اسی وقت تک حضور ﷺ کو علم مشاہدہ رہا جب وہ وقت ختم ہوا وہ علم و مشاہدہ ختم

ہوا۔ اور آپ اس انکشاف سے پہلے جس طرح بے خبر تھے ایسے ہی اب بھی بے خبر ہو گئے۔ ہم نے اس کے جواب میں کہا تھا اولاً: آدمی کو اسی کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے جسے وہ جانتا ہو، آپ نے خواہ مخواہ منطق کی اصطلاح استعمال فرمائی اور فضیحت میں پڑے، قضیہ وقتیہ میں حکم بشرط الوقت ہوتا ہے، اور حدیث ”تجلی لی کل شیء“ میں وقت اس انکشاف کی شرط نہیں ہے، صرف ظرف ہے، اس لیے اس کو آپ کا قضیہ وقتیہ کہنا غلط ہے۔ اور آپ اپنے معلومات پر نظر ثانی کریں۔

اور ثانیاً: کھینچ تان کر اگر وقتیہ بھی ہو جائے، تو دوسری حدیث میں قیام کی شرط اخبار کے لیے ہے، تو آپ کا خبر دینا قیام منبر تک مخصوص رہے گا۔ نہ کہ اس کا جاننا۔ اور ہمارا استدلال حدیث کے لفظ ”أنبأتم“ سے نہیں ہے، حضور ﷺ کے قول ”لا تسئلونی عن شیء“ سے ہے کہ جو چاہو پوچھو؟ اس لیے آپ کا اعتراض اس پر بھی بے موقع ہی ہے۔

ابطال میں مولوی رئیس احمد صاحب نے معجزات کے عنوان سے جو بات ذکر کی ہے، وہ گویا ہمارے انہیں مواخذوں کا جواب ہے کہ معجزات وقتی بھی ہوتے ہیں کہ جس وقت اس کا ظہور ہوا اسی وقت کے لیے، نہ اس کے پہلے نہ اس کے بعد، اور حاضر و ناظر ہونا بھی ایسے ہی معجزات میں ہے جو وقتی ہیں، اس لیے اگر کسی حدیث میں آپ کا کامل علم و انکشاف ثابت ہو بھی تو اس کا مطلب صرف تھوڑی دیر کے لیے علم انکشاف ہوتا ہے بعد میں نہیں۔

رئیس صاحب کی اس بات پر ایک سوال تو وہ ہے جسے ہم نے مولوی عبدالرؤف صاحب سے کیا تھا جواب تک لا جواب ہے، اور جس سے مولوی صاحب کی وکالت کے باوجود رئیس صاحب بھی دم سادھے رہے۔ وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اسی علم و انکشاف کو تو آپ لوگ شرک کہتے ہیں، تو کیا کوئی شرک ایسا بھی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے ہو تو شرک نہیں؟

دوسرا قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ بعض معجزات وقتی ہوتے ہیں اس پر تو رئیس صاحب نے بڑی گرما گرم بحث کر ڈالی، اور منکر پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا، حالانکہ ان کا خصم بھی اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن دوسرا مقدمہ کہ معنی حاضر و ناظر رسول اللہ کا وقتی معجزہ ہے اس سے صاف دامن بچا گئے، نہ کوئی عقلی دلیل پیش کی نہ نقلی، اور بے چارے پیش بھی کہاں سے کرتے، دلیل تو قرآن و حدیث میں اس بات کی ہے کہ یہ آپ کا دوامی معجزہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ امت کا اجماعی مسئلہ ہے کہ قرآن عظیم رسول اللہ ﷺ کا دوا می معجزہ ہے، اسی قرآن عظیم میں ہے: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا کھلا بیان ہے، تو جب تک قرآن ہے تب تک یہ بیان اور اسی وقت تک رسول اللہ ﷺ کا علم پس علم رسول دوا می ہوا۔

اور حدیث شریف میں ہے ”إِنَّ اللَّهَ قَدْ رَفَعَ لِي الدُّنْيَا، فَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهَا وَإِلَى مَا هُوَ كَائِنٌ فِيهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.“ دنیا میرے سامنے لائی گئی تو میں اس میں جو کچھ قیامت تک ہے دیکھتا رہوں گا۔

اس حدیث مبارک پر مولوی عبد الرؤف صاحب نے تنقید بھی کی جس کا جواب ہم نے الشاہد میں دیا، وہ تو چپ ہیں ہی مولوی رئیس احمد صاحب مولوی عبد الرؤف صاحب کے وکیل بھی خاموش رہے جس کا مطلب یہی ہے کہ یہ حدیث ان حضرات کو تسلیم ہے، پس یہ حدیث تو الحمد للہ ہمارے دعویٰ کا عین بیان ہے۔

اس لیے وقتی اور دوا می معجزہ کی موشگافی مولوی رئیس صاحب کے لیے وبال ہی ثابت ہوئی۔ ﴿وَكَذَلِكَ الْعَذَابُ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾

ہاں یہ علم وانکشاف باری تعالیٰ کے علم وانکشاف کی طرح نہیں کہ ایک آن کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، توجہ نہ رہے تو یہ امور آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتے ہیں، اور ذہن سے نکل بھی جاتے ہیں، مگر ایسے ہی کہ پھر توجہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پھر منکشف فرما دیتا ہے جیسا کہ سفر معراج میں بیت المقدس کے علم سے وال کے وقت درپیش ہوا جس کا حوالہ خود رئیس صاحب نے بھی دیا ہے: ع مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

پسینہ اور سایہ رسول:

اس سلسلہ میں مولوی رئیس احمد صاحب کا خاص اعتراض یہ ہے کہ ان امور کو مسئلہ حاضر و ناظر سے کوئی تعلق نہیں، گذارش ہے کہ ان امور کو اس مسئلہ کے ثبوت میں پیش بھی تو نہیں کیا گیا ہے، ان کا حوالہ تو صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ صاحبان ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کو عام انسانوں پر قیاس کرنا چھوڑ دیں، ان کی بارگاہ بہت عالی اور ذات نہایت بلند ہے۔

نسبتے نیست بہ ذات تو بنی آدم را زانکہ از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

﴿فہرست مضامین "الشاہد"﴾

۳	تقدیم
۳	مختصر سوانح بحر العلوم
۳	نام و نسب
۳	مولد و مسکن
۴	وطن مبارک پور
۴	والد ماجد اور جد امجد
۵	تعلیم و تربیت
۵	اساتذہ کرام
۹	امتحان و فراغت
۱۰	درس و تدریس
۱۱	دارالعلوم اشرفیہ میں تفرری
۱۲	شش العلوم گھوسی میں تقرر
۱۲	مشاہیر تلامذہ
۱۳	فتاویٰ رضویہ کی اشاعت
۱۴	تصانیف و تراجم
۲۲	وعظ و خطابت
۲۲	شعر و سخن میں مہارت
۲۵	علالت و انتقال
۲۵	اولاد و احفاد
۲۶	صاحب زادے مولانا محمد احمد مصباحی
۲۹	کچھ الشاہد کے بارے میں
۱۳	کتاب کے مندرجات
۳۹	الشاہد کا پس منظر
۵۰	باب فضائل کے چند اہم اصول

۵۴	رفع شک
۵۷	افضلیت سید المرسلین
۵۸	آپ کا وجود گرامی دنیا میں
۶۲	عداوت مصطفیٰ کی حد ہو گئی
۶۵	ایک شبہ اور اس کا جواب
۶۹	ایک غلط فہمی کا ازالہ
۷۰	پوری بحث ایک نظر میں
۷۱	اس عبارت کے دو جز ہیں
۷۳	حاضر و ناظر اور علمائے سلف
۷۷	اقوال کی بحث
۷۹	حاضر ناظر اور فاضل رحمانی
۸۰	مسئلہ حاضر و ناظر اور مولانا عتیق الرحمن صاحب
۸۱	شہادۃ کی بحث
۸۲	شہادت کے معنی
۸۲	شہادت بالتسامح
۸۳	امت کی شہادت
۸۳	شہادت توحید
۸۳	تنبیہ
۸۴	شہادت کی وسعت
۸۷	بحث کا اعادہ
۸۷	حضور جسمی
۸۸	مزکی یا شاہد
۹۲	احادیث
۹۵	ایک دل چسپ گرفت
۹۷	یخبر کم بما مضی
۹۹	اختصار
۹۹	آیات